

UNIVERSAL  
LIBRARY

OU\_222208

UNIVERSAL  
LIBRARY

U<sup>o</sup> - U<sup>o</sup>

^9154444

E<sub>2</sub> 7

16280

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. *101/1915/222* Accession No. *1721.*

Author *(Handwritten name)* *1628*

Title *(Handwritten title)*

This book should be returned on or before the date last marked below.





# سُرخِ پرچمِ تلے

مُرتَبَّہ  
سرور الہام

ناشر  
راج پبلشنگ ہاؤس حیدر آباد (دکن)

تاریخ اشاعت \_\_\_\_\_ جنوری ۱۹۴۶ء

نقداد ایک ہزار

باہتمام

پروفیسر بی بی پوری

ناظم راج پبلشنگ ہاؤس

Checked 1975

سول ایجنٹ:-

دینا نیک سیٹلائٹ کمپنی پوسٹ بکس (۳۶) سکندر آباد (دکن)

صفحہ	نام مصنف	عنوان
۴		انتساب
۵	جناب قاضی عبدالغفار صاحب "پیام"	مقدمہ
۷	محترمہ ذکیہ سلطانہ صاحبہ "ایشیا"	پیش لفظ
۱۳	مرتب -	تعارف
۱۵	وانداد اسلیف سکایا	آئرن کر اس
۲۰	بی۔ آر لوف	آخری کار توں تک
۳۱	نگولائی سخوناف	خانہ بان
۳۸	ادگر اسنو	عینی مشاہدے
۶۴	ایلینا کونونکو	گر بلا لڑکی - ایسا
۷۵	"	تباہ کن فوج کی ایک لڑکی
۸۲	"	انتقام
۸۶	"	جھاو رو نوک
۹۷	نگولائی سخوناف	ایک عقیدہ مند سپاہی
۱۰۶	"	سبب کما درخت
۱۱۳	"	سن رسدہ سورما
۱۲۰	"	نئی زندگی

---

انتساب

مستقبل کے نام

---



نقوش ان صفحات پر پیش کئے گئے ہیں۔ انتساب مستقبل کے نام ہے۔ ہندوستان کے ہر نوجوان کے لئے اس سے بہتر انتساب کچھ نہیں ہو سکتا نئی نسل کی جوانی کے تصورات مستقبل سے جس قدر قریب ہو جائیں اور ماضی کے افسانوں کو جس قدر پیچھے چھوڑ دیں اتنا ہی وہ ہمارے وطن کی قوت تخلیق و تعمیر کے ضامن ہو سکیں گے۔ "پدرم سلطان بود" کے طلسم خیال میں ہمارے ملک کے لاکھوں نوجوان اپنی زندگیاں برباد کرتے ہیں وہ "حال" کو اپنے سامنے رکھیں اور صرف مستقبل ہی سے اپنے حال کی تعبیر مانگیں۔ روسی حجابان وطن کے یہ افسانے اگر ہماری زندگی کے کسی گوشے میں کچھ حرارت پیدا کر سکیں تو میری رائے میں سردار الہام صاحب کی یہ کوشش کامیاب ہے۔

محمد عبدالغفار

# پیش لفظ

انقلاب کائنات کا محور ہے اور یہ محور ارتقاء کا ایک فطری خاصہ ہے ہماری تمام تاریخ اسی خاصہ کی کار فرمائیوں کی ایک نہ ختم ہونے والی داستان ہے جسے ہر زمانہ کہتا رہا اور ہر زمانہ کہتا رہیگا۔ اس تاریخ کے بڑے بڑے عنوان سیاسی و اخلاقی ہیں جنہیں عمرانی شعور کے لحاظ سے انسان نے عہد بہ عہد وضع کیا اور اسی طرح ماحول و وقت کے تقاضوں کی بنا پر اخلاقی مذاہب آئے اور عہد بہ عہد اپنی افادیت و تازگی کے ساتھ کچھ صدی تک تجربہ و استعمال میں رہے اور جب انکی افادیت ختم ہو گئی تو ان کی قدریں بھی ختم ہو گئیں اور قدروں کے ساتھ ضرورت بھی مگر محو گھومتا رہا، زندگی کا سفر تیز رفتاری سے جاری رہا یہاں تک کہ زندگی آگ نکل گئی اور یہ نظام و مذاہب پیچھے پڑے رہ گئے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایرانی، آریائی اور تمام اسرائیلی مذاہب کا یہی حشر ہوا۔ زندگی اپنا خول بدلتی رہی اور یہ

لباس کے رنگا رنگ نقوش کی طرح لباس کے ساتھ اپنی افادیت و رونق کھوتے رہے۔

بظاہر تمام سیاسی نظاموں اور اخلاقی مذاہب کا واحد مقصد یہ تھا کہ انسان کی زندگی میں وہ مسرت پیدا ہو جو اس کے مادی و روحانی مصائب کا علاج ہو سکے۔ تفصیل سے قطع نظر میں صرف یہہ بتانے پر اکتفا کرونگی کہ روس کے انقلاب (سائے) یعنی اٹھارویں صدی سے قبل یورپ اور ایشیا میں پیدا ہو چکے والے تمام اخلاقی و سیاسی نظاموں کا پس منظر وہ روحانی اسپرٹ تھی جو انسان کی دنیا کو مابعد الحیاتی اجزا کے نقطہ مسرت پر مرکوز کرتی تھی گزرشتی اصول سے لیکر عیسائیت تک تمام اخلاقی مذاہب سیاست کے قبضہ اقتدار میں رہے۔ یہاں تک کہ بدھ ازم بھی بالآخر سیاسی قبضہ اقتدار سے آزاد نہ رہ سکا اور اسلام بھی۔ اسی ذہنی غلامی کا نتیجہ سیاسی نظاموں کی بے لگامی اور نقص کی صورت میں نکلا اور تمام سیاسی نظام عوام کے چاکر ادارے ہونے کے بجائے نسل انسانی کی لوٹ کھسوٹ کا ایک خطرناک آلہ بن گئے۔ انکا نتیجہ خطرناک تھا کہ دنیا دو ہزار برس تک شہنشاہیت کے زیر اثر سکتی رہی۔

جاگیر داری نظام کو جہاں فنون و علوم اور دوسرے عمرانی ارتقاء کی سند دی جاسکتی ہے وہاں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس نظام میں اگر صحت ہوتی تو عمرانی ارتقاء کہیں زیادہ وسیع اور بلند چمانے پر

ہوتا اور شاید نسل انسانی کو وہ "فردوس" مل جاتی جو "گمشدہ" نہیں تھی بلکہ جو اُس کے ہاتھ ابھی تک لگی ہی نہیں تھی۔

بہر حال کائنات کا محور نیزی سے گھوم رہا تھا اور اسے نئی تبدیلیاں کرنی تھیں، بالآخر جاگیر داری کا رد عمل انقلابِ فرانس کی صورت میں ہوا۔ یہ انقلاب، انقلابِ روس کا مقدمتہ الجیش تھا جو اس سے ڈیڑھ سو برس قبل خود فرانس کے امراء کے ہاتھوں عوام کی امداد سے ہوا۔ اور اسکے بعد مارکس کے اقتصادی فلسفہ کی بیادوں پر ایک نئی تبدیلی کا خاکہ دنیا کے سامنے آیا۔ جو بالآخر انقلابِ روس کی بنیاد بنا۔ روس کا سیاسی انقلاب ہمارے عہد ہی کی چیز ہے اور ہم اس کے عالمگیر اثرات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

افلاطون۔ تمزدک، برہس اور روسونے مارکس سے پہلے سماج کی بنیادیں جمہوری اور مادی اصولوں پر قائم کرنی چاہئیں (اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم ترین سیاسی و سماجی نظام اپنی قدریں کس قدر قبل کھو چکے تھے) اس کے بعد سترھویں صدی میں حکیم جون لوک نے انفرادی و اجتماعی حقوق و فرائض اور نظام جمہوری کا خاکہ پیش کیا

بہر حال یہ سلسلہ سو سو برس میں کارل مارکس تک پہنچا۔  
۱۸۴۸ء میں اینگلز اور کارل مارکس نے دنیا کو اشتمالیت کی دعوت دی اور مارکس نے اپنی مشہور عالم تصنیف "سرمایہ" (کپٹل)

تحریر کی۔ غرض کہ کارل مارکس ایک مادی پیغمبر کی حیثیت سے نمودار ہوا اور اسی کے مادی فلسفہ کی بنیادوں پر روس میں لینن نے انقلاب پیدا کر کے اشتراکی نظام کو جاری کیا جو اب تجربوں کی حدوں سے نکل کر ایک بین حقیقت بن چکا ہے جس کے اثر سے مشرق آزاد ہے نہ مغرب! میری تحریر کا مقصد اہل میں یہ نہیں کہ مارکسیت یا اشتراکیت کے درجہ بدرجہ ارتقاء یا اسکی تفصیلی تاریخ سے بحث کر دوں۔ یہ اس کتاب کا موضوع بھی نہیں لیکن افسانوں کا یہ مختصہ مجموعہ ان مسائل سے ایک منطقی تعلق ضرور رکھتا ہے اور اسی لئے میں نے آغاز میں ان اشاروں کو ضروری خیال کیا جو کئے گئے۔

آپ جانتے ہیں کہ جس طرح مارکس نے ایک نئے مادی فلسفہ کی ترتیب و تخلیق کی اور اس کی بنیادوں پر کمونسٹ روس پیدا ہوا۔ اسی طرح ایک موافق و عارضی ردِ عمل جرمنی میں ہوا۔

جرمنی میں ————— نیشے نے ناسی ازم کا بیج بویا۔ مارکس دوت کو مساوی طور پر تقسیم کرنے اور عوام میں ایک کلچرل سطح قائم کرنے کا قائل تھا اور نیشے اس کے رد کے طور پر کہتا تھا کہ عوام کوئی چیز نہیں ہیں انہیں راحت تو دینی چاہئے لیکن اس خوشی کی کبھی اشرف (بورژوا) کے ہاتھ میں ہونی چاہئے۔ نیشے کے عمرانی تصور کے منطقی نتائج ایک قوم کی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ایک طبقہ کی اجارہ داری کی صورت میں نکلتے ہیں، لیکن مارکس کا مذہب ایک حکیمانہ مذہب ہے اور اس کے عمرانی نقشے کی

حد میں، مزدوروں اور کسانوں کے ٹوٹے ہوئے دلوں تک جاتی ہیں  
ایک کلچر کو محدود اور دوسرا محدود کر دینا چاہتا ہے۔

بہر حال مارکسی روس، اور نائٹسی جرمنی، دو ایسی مخالف و متضاد  
قوتیں دقت کے بطن سے ابھریں جنکا تصادم کسی نہ کسی بیج سے ہونا ہی  
تھا لیکن ہوا وہ دوسری جنگ عظیم کے نام پر! ؟

اور دنیائے یہ دیکھ لیا کہ ایک پارٹی کے مقابلہ میں جو کسی قوم یا ملک  
کی کامل اجارہ داری کی مدعی بنتی ہے۔ عوام کی قوت بہت زیادہ ہے۔  
ہٹلر اور اس کی پارٹی فنا ہو گئی۔ اسٹالن اور اس کے پشت پناہ عوام  
فاتح و کامیاب ہوئے۔

یہ چند مختصر افسانے جنہیں روں کے نئے افسانہ نگاروں نے  
لکھا اور ملک کے نوجوان اور ذہین افسانہ نگاروں نے ترجمہ  
کیا ہے اس عظیم ترین روح کو پیش کرتے ہیں۔ جو ہمارے زمانہ کی سب سے  
بڑی اور خوفناک لڑائی میں روس کی ایک ایک عورت، ایک ایک نوجوان  
اور ایک ایک بچے میں دوڑی ہوئی تھی۔ اور جو بالآخر ہزاروں قربانیوں  
اور لاتعداد مصائب اٹھانے کے بعد روس اور اشتراکیت کی فتح کا  
سبب بنی،

یہ افسانے ہمارے لئے اپنے اندر سبق پوشیدہ رکھتے ہیں، اور وہ سبق  
یہ ہے کہ ”زندگی اور انسانی جان مقصد کے مقابلے میں، بیچ ہے“ مقصد  
کے لئے جیو اگر جینا ہے، اور اگر مرنا ہے تو یوں مرنے سے کیا فائدہ مقصد

کے لئے مرو، کہ مقصد ہی زندگی ہے، اگر کسی قوم کی زندگی کا کوئی اجتماعی  
 آئیڈیل نہیں تو وہ قوم کہلانے کی مستحق نہیں، بھیرڑوں کا ایک گلہ ہے،  
 جس کی قسمت میں اُون کے تاجر کی قینچی اور قصائی کی تیز چھری کے  
 علاوہ کچھ نہیں،

ان انسانوں کو ترجمہ کہہ کے سردار الہام صاحب نے بہت بڑی  
 خدمت کی ہے، جس کے لئے اردو داں طبقوں اور اتحادیوں کو ان کا  
 شکر گزار اور ممنون ہونا چاہئے۔ کم از کم میں ان کو دلی مبارکباد  
 دے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ان چند کہانیوں میں ہمارے مردہ دلوں  
 کے لئے بیداری کا بہت کچھ سامان پوشیدہ ہے۔

ذکیہ سلطانیہ ساغر

# تعارف

عوامی جنگ کی ابتدا ہی سے تقریباً تمام ممالک کے ادیب ایک نئے ادب کی تخلیق میں مصروف رہے۔ لیکن بجا طور پر اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ سوویت یونین کے ادیبوں نے برطانوی امریکی اور دوسرے ممالک کے ادیبوں سے کہیں زیادہ کام کیا ہے۔

جنگ کے دوران میں سوویت ادیبوں کے کارنامے حریت پسند ممالک کے باشندوں تک پہنچ چکے ہیں۔ کئی ادیبوں نے فوجی افسر اور سپاہی کی حیثیت سے مادر روس کی مدافعت کی۔ بعض اخباروں کے نمائندے تھے اور اپنی پر جوش تحریروں سے عوام کے جذبات ابھارے۔ انھوں نے اپنی نظموں، کہانیوں، ڈراموں اور ناکوں کے ذریعہ عوامی جدوجہد کو فنکارانہ انداز میں پیش کر کے اہل علم سے خراج تحسین حاصل کیا۔ ان کی تحریروں میں خلوص اور تجربات میں صداقت تھی اس لئے یہ کہنا صحیحاً غلط ہے کہ سارا جنگی ادب، پردہ بگنڈے پر: فی ہے۔ جیسے کہ تمام طور پر کہا جاتا ہے۔

اڈگر اسنو ہی کو لیجے جو ایک ترقی پسند امر کی جرنلسٹ ہے اور ہم  
ہندوستان اور چین کی آزادی سے متعلق اس کی بے پناہ ہمدردیوں سے  
بخوبی آگاہ ہیں۔ اپنی تصنیفات ”رڈ اسٹار او۔ چائنا“ اور ”اسکار چڈاوتہ“  
کے ذریعے اس نے ہندوستانیوں کو جاپان کے خلاف چینوں کی بے جگرانہ  
جدوجہد سے روشناس کیا۔ سب جانتے ہیں کہ وہ برطانوی ایجنٹ ہے  
نہ ہی کمیونسٹ۔ ہم اڈگر اسنو کے تحریر کردہ عینی مشاہدات کو شائع کر رہے  
ہیں۔ جو ”سنڈے ایونگ پوسٹ“ مطابق ۲۹ مئی ۴۳ء میں شائع ہوئے  
تھے۔ یہ سب حالات اسکے چشم دید واقعات ہیں جو رز ہیف میں سرخ فوج  
کے جرموں کو بھگانے کے بعد وہاں کے باقی ماندہ باشندوں سے معلوم ہوئے۔  
علاوہ ازیں ”آئرن کراس“ واندو اسلیفسکا یا کافسانہ ہے جو  
پولینڈ کی ایک نامور ادیبہ ہے اور اس عوامی جنگ میں اس نے خود حصہ لیا  
اپنی ادبی تحریرات کے باعث اُس نے استالن انعام بھی حاصل کیا۔ نکولائی  
تخوفات لینن گراڈ کا شاعر اور ادیب ہے اور محاذ پر فسطائیت کے خلاف  
جہاد میں مصروف رہا۔ جسے شاعر کا استالن انعام دیا گیا۔ اسی طرح  
ایلینا کونونکو اور ارون بھی روسی ادیب ہیں۔

”آئرن کراس“ ”فانڈان“ اور ”انتقام“ ”قومی جنگ“ میں شائع  
ہوئے ہیں اور ”گوریلان کی اینا“ ”ایشیا“ میں بقیہ کہانیاں غیر مطبوعہ ہیں۔

سردار الہام

# ”آرن کر اس“

نم آلود زمین پر اُگے ہوئے درختوں سے پرے چھوٹی چھوٹی پھیلی ہوئی پہاڑیوں کے دامن میں کھیت لہلہا رہے ہیں اور سورج کی روپلی کرنیں جگ رہی ہیں گمان تک نہیں ہوتا کہ پھیلے ہوئے دشت میں جہاں اودے جنگلی بھول کھلے ہوں اور پکے دھانوں کے سنہرے کھیت لہلہا رہے ہوں کوئی غیر معمولی بات پیش آسکتی ہے۔

لیکن درخت بے ترتیبی سے کٹے ہوئے ہیں اور جا بجا خندقوں سے ”ٹینک ٹور“ تو ہیں اپنا منہ نکالے جھانک رہی ہیں۔ جرمن آہستہ آہستہ بڑھ رہے ہیں اور عموڑے عموڑے وقفے سے مہیب توپوں کی گج دار آوازیں فضا میں گونج رہی ہیں۔ ہمارے سردوں پر ————— درختوں کی چوٹیوں سے اوپر ————— کچھ آوازیں ! جیسے پرندوں کا غول یک بیک کسی بڑے آہنی پتھر سے ربا ہو کر تیزی سے پرواز کر رہا ہو۔ سیدھی جانب سے مشین گن کی مسلسل آوازیں آرہی ہیں۔ پرندوں کے پروں کی آوازیں فضا میں کھو گئیں اور جنگ کی بولناک صدائیں سنائی دینے لگیں۔

ان تنگ خندقوں اور اس جنگل میں مختلف چہرے نظر آ رہے ہیں۔ یہ سرخ سپاہی روس کے ہر حصے سے آئے ہیں جو ایک دوسرے کے مخلص دوست اور وفادار ساتھی ہیں۔ ان کی زبانیں ان کے اپنے قبصے اور شہر اور ان کے طور طریق جدا جدا ہونے کے باوجود وہ چیز جس نے انہیں محبت کے بندھنوں میں جکڑ رکھا ہے۔ مشقت اور ایک مشترکہ مقصد کے لئے سرخ پرچم کے تلے جدوجہد ہے آج ان کی دوستی اور زیادہ مستحکم ہو گئی جب کہ وہ دوش بدوش اپنے مقدس وطن کے لئے خون بہا رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کا فرض کیا ہے اور وہ یہاں کیوں آئے ہیں۔ انہیں جرمنوں کا سامنا ہے اور پشت پناہی پر محبوب وطن ہے۔ تنگ خندقوں کی مسلسل قطار شمال سے جنوب تک چلی گئی ہے جو ایک مستحکم سرحد کا کام دیتی ہے۔ اور اس پر روس کے جانناز سپاہی متعین ہیں۔

ہم کچھ دیر "ٹینگ ٹوڈ" توپوں کے قریب سستارہ تھے۔ کمانڈر نے ہمیں ایک تمغہ دکھلایا "آئرن کراس" جو کسی مردہ جرمن کے سینے کی زینت تھا۔ میں نے جرمن تمغہ اپنے ہاتھ میں لیا رو پہلے کناروں کا سیاہ تمغہ جس پر "۱۹۳۹" لکھا تھا۔

ایک ہی دھماکے میں سب کچھ گونج اٹھا ہے۔ جنگل۔ خندقیں اور میں نے گرجتی ہوئی توپوں کی آوازیں سنی۔ جرمن "آئرن کراس" سے ایک شعلہ سا اٹھتا دکھائی دیا۔ اس آگ کا پرتو جس نے پوسٹانی گاؤں بسم کر ڈالے یا ان بیگناہوں کے خون کا عکس جو پولینڈ میں مارے

گئے۔ ان مصیبت زدہ عورتوں اور مردہ بچوں کا خون جنہیں مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔

”انیس سو اٹالیس“ — کس لئے ؟

جواں مردی کے صلے میں ؟ ۱۹۳۹ کا آئرن کراس پولینڈ میں داخل ہونے کے بعد کارہائے نمایاں کے سلسلے میں دیا گیا تھا۔

آخر اسے کن کارہائے نمایاں کے سلسلے میں یہ انعام دیا گیا ؟ دارساکی تباہیوں کے صلے میں ؟ کراگو کی حدوں سے گزرنے کے صلے میں۔ آتشزدہ شہروں اور دیہاتوں کی بربادی کے صلے میں ؟ ۱۹۳۹ء سے اب تک اس جرمن افسر نے اپنے ضمیر کی پشیمانی کے بغیر اسے لگائے رکھا۔ اور اس تمغہ کو اپنے سینے کی زینت بنائے مختلف شہروں سے گذرتا رہا۔ سیاہ تمغہ پر بلجیم، فرانس، الیٹا اور ناروے کی آتشزدگیوں کے پر تو نظر آ رہے ہیں اور بلجیم، ناروے اور فرانس کے بچے جو فرزدہ نظروں سے اسے گھور رہے ہیں۔ نخوت اور غرور کے نشے میں چورا، جرمن افسر آئرن کراس سینے پر لٹکائے اپنے مفتوحہ علاقوں سے گذرتا رہا۔ باآخر قسمت اور اس کے کمانڈر کے حکم نے اسے یہاں پہنچا دیا۔ یوکرین کی سرحد پر اور یہیں وہ تمغہ اور اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہ ایک سرخ فوج کے کمانڈر کا ہاتھ تھا جس نے دشمن افسر سے تمغہ چھینا۔ سیاہ تمغہ — رو پہلے کناروں کا۔ وہ اس بات کی شہادت تھا کہ جرمن افسر نے اپنا فرض ایک غارت گر کی حیثیت سے انجام دیا ہے۔

یوکرین کی سرحد پر — ایک سرخ فوج کے کمانڈر نے ایک  
تمغہ میرے ہاتھ پر رکھا۔ ایک جنگی انعام۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ تاریخ پر کوئی توجہ نہیں دے رہا ہے۔ کیونکہ وہ  
اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن یہ بے جان دھات کا ٹکڑا کتنا عبرت  
آموز ہے یہ سرخ فوج کا ایک کمانڈر ہے جو بیگناہوں کے خون کا انتقام  
لے رہا ہے اپنے ملک کی مدافعت کے ساتھ ساتھ وہ مفتوحہ قوموں کی امداد  
کر رہا ہے۔ وہ پولینڈ، بلجیم، فرانس اور ان ملکوں کے لڑ رہا ہے جو آہنی  
زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ وہ عوام کا منتخبہ ساونت ہے تہذیب  
کا چندہ بہادر ہے۔ ان کا غازی اور انہیں رہائی دلانے والا۔

مجھے ان دنوں کا خیال آیا جب دو سال پہلے ۱۹۳۹ میں میرے  
پولینڈ کے دوران قیام میں ہٹلر نے غارتگری شروع کی۔ ساتھ ہی  
اس وقت کا بھی خیال آیا جبکہ یہ سلسلہ اسکی ناگزیر شکست پر ختم ہوگا۔  
میرے لئے یہ تمغہ اور اسکی تاریخ فاشستی خون کی تحریک کی یادگار  
ہے اور سرخ فوج کے کمانڈر کے ہاتھ میں — فاشستوں کی تباہی  
کا بین ثبوت۔

یک بریک بارڈہ جلی۔ سرزوں کے اوپر، درختوں کی چوٹیوں سے  
وہ — دور افق کے قریب فضا میں جیسے بجلی سی چمکنے لگی اور  
ادادل کی دوسری جانب خندقوں پر تعینہ سپاہی میدان اور کھیتوں  
کی محافظت میں مصروف ہیں۔

کمانڈرنے "جرمن کراس" اپنی جیب میں رکھ لیا اور ہم سب خاموش اور ساکت رہے۔ خندقیں، اسلحہ، توپ خانہ سب کچھ فتح کی پیشین گوئی کر رہے ہیں۔ اور سپاہیوں کے مطمئن چہرے گویا کہہ رہے ہوں کہ — چلے جو کچھ بھی ہو — کتنی بھی مصیبتوں کا ہمیں سامنے کرنا پڑے۔ ہم اور صرف ہم ہی فتحیاب رہیں گے۔

# ”آخری کار توں تک“

ہمارے ایک اسکاؤٹ دستے نے ایک جرمن پٹرول کا پتہ لگایا شام  
 ڈھل چکی تھی جرمنوں کو کسی خطرہ کا لگان نہ تھا۔ اس غیر آباد علاقہ میں کیا  
 خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ گہرا کھوت چھایا ہوا تھا اور فاشستی پٹرول  
 نے اطراف بے پروا پانہ نظریں ڈالیں۔

اسکاؤٹس آہستگی اور خاموشی سے زمین چھوتے ہوئے آگے بڑھ  
 رہے تھے۔۔۔۔۔ ان کے سارے جنٹ داسلی کسلیا توں نے اپنے دل کو  
 دھڑکتے ہوئے پایا۔ ہر جرات آمیز اقدام کے موقعہ پر ایسا ہوتا ہے اور اسپر  
 سراسیمگی سی طاری تھی۔ وہشت قدرے دور ہوئی اور اس نے ہر چیز کا  
 جائزہ لیا تاکہ ہوشیاری سے سارے کام سرانجام پائے پھر خاموشی  
 چھا گئی اور ایک بار اس نے اپنے طریقہ کار پر غور کیا۔ یہ کارروائی  
 جذبات پر مبنی تھی لیکن سیرسارے جنٹ جاننا تھا کہ بہادری فتح کی  
 ضامن ہے۔ اسے پورا وثوق تھا کہ ہر چیز اسکے حسب منشا تکمیل پا جائیگی

اور ساری کارروائی اسی انداز میں ہوگی جیسا کہ اسکے ذہن میں خاکہ موجود ہے۔

کبھی کبھی فاشستی اس سمت نظریں دوڑاتے جہاں اسکاٹ بڑھ رہے تھے لیکن انہیں مطلق پتہ نہ لگ سکا۔ سرخ فوجی قریب سے قریب تر ہو گئے اور انہیں فاشستوں کی ساری آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اپنے اسلحہ صاف کرتے، گپ ہانکنے اور سگریٹ نوشی میں مصروف تھے۔ کچھ لوگ مشین گنوں کے پاس موجود تھے اور ان کے قریب ہی مسلح گاڑیاں تھیں۔

یہیں، گاڑیوں پر پہلا حملہ ضروری تھا۔ کسلیا قون نے آہستگی سے اپنے آدمیوں کو ان کے کام سمجھا دیئے۔

”جیسے ہی کہ تمہیں لفظ ”ہیرا“ سنائی دے اپنا کام شروع کر دو اور دستی بمب پھینک کر انہیں منتشر کر دو۔ اب ہمیں آگے بڑھنا چاہئے۔“

کامریڈز

جنگجو پھر نہایت احتیاط سے آگے بڑھنے لگے تاکہ دشمنوں کو ان کی موجودگی کا پتہ نہ لگ جائے اور اب وہ فاشستوں سے بہت ہی قریب پہنچ چکے تھے۔ کسلیا قون نے بمب اٹھایا۔ ”میرے پیچھے پیچھاؤ کامریڈز — اپنی مادر وطن کے لئے — ہیرا“

اور یکا یک ایک انتشار پھیل گیا۔ بموں نے استادہ گاڑیوں کو ناکارہ کر دیا۔ ایک دہشت خیز حملہ جاری تھا۔ اور کچھ ہی دیر پہلے چلا

خاموشی اور سکوت حکمران اتحاد ہشت اور سر اسکی پھیلی گئی۔ ناشستی بوکھلا کر بھاگنے لگے۔ لڑہ خیز آوازیں گونجنے لگیں اور غیر متوقع خوف و ہراس چھا گیا۔ سوویٹ اسکاؤٹ کے ایک کم تعداد دستہ کیلئے اور کیا طریقہ کار ممکن تھا سو اس کے کہ مسلح گاڑیوں کو از کار رفتہ کر کے جرمنوں کو بھاگ نکلنے پر مجبور کر دیں بظاہر تو اور کوئی امکان نہ تھا لیکن روسی جان بازی بہادری اور حب الوطنی سے انہوں نے کام لیا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ سینیر سارجنٹ کسلیا قوت نے کمال مستعدی سے دشمنوں کو خاطر خواہ جانی و مالی نقصان پہنچایا۔ جرمنوں کو یہ سوچنے کا موقع بھی نہ تھا کہ کیا گذری ہے۔ انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور اس طرح از خود اسیر ہو گئے۔ کسلیا قوت جانتا تھا کہ بہ سرعت تمام کام انجام دینا ہے قبل اس کے کہ جرمن سنبھل بھی سکیں۔ وہ جرمنوں کے خالی شدہ چہرے میں گھس گیا۔ وہاں اس نے ایک آہنی صندوق پایا جس میں دشمن کے خفیہ دستاویزات محفوظ تھے۔ وہ صندوق اٹھا کر لوٹ آیا۔ "ہر کام بخوبی طے پایا کامیڈز" اور جانبا ز روسی اسکاؤٹ لوٹنے لگے۔

ایسے ہی کتنے جرات آفریں حملے انہوں نے کئے۔  
 واسلی کسلیا قوت — جنگ کے دوران میں اس نے اپنی اعلیٰ فوجی قابلیتوں سے کام لیا ان پتھر پلے راستوں اور کوہستانی علاقوں میں — جرمن مقبوضہ مقامات پر وہ اپنے فریض کی پابجائی کر رہا تھا۔

اور خفیہ دستاویزات فراہم کرتا، قیدیوں سے فوجی راز معلوم کرتا اور دشمنوں کو تباہ کرتا ہوا ایک بن بگائے مہمان کی طرح موجود تھا۔

اسکی ساری صلاحیتیں اور جانبازانہ قابلیتیں جائز طور پر استعمال ہو رہی تھیں اور مردانہ دار ہر صعوبت کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ جارحانہ کارروائیوں میں مشغول تھا۔ اس کا میدان عمل وہ مقام تھا جہاں فاشست نفل و حرکت جاری تھی وہ مجسمہ بہادری بنا ہوا ان راہوں پر اپنے جیسے جو شیلے چند افراد کی ایک جماعت لئے ہوئے نظر آتا اور یوں حملہ آور ہوتا جیسے وہ دشمنوں پر ٹوٹ پرنے کے کوئی موزوں و مناسب موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا ہو۔ وہ ہمیشہ غیر متوقع طور پر اور اچانک فاشستوں پر حملہ آور ہو کر انہیں سراسیگی اور نقصانات کا شکار بنا دیتا۔

اس نے اپنی تمام تر فوجی قابلیتوں کو اجاگر کیا اور اس دانشمندی اور چالاکی سے کہ دشمنوں کی راہوں سے گذرنے میں اس کا جواب مشکل سے ملے گا جیسے کہ اسکے جرأت آمیز اقدامات اور اچانک حملوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں بہادری جوش اور موقع شناسی کی وہ ساری خوبیاں جو ہیں جو ہمارے سرخ فوجیوں کا خاصہ ہے۔ واسلی کسلیا قوف اپنی ماہر وطن کا فرزند ہے۔ جس میں شجاعت، اعلیٰ صلاحیت، فوجی قابلیت، جوش، پھرتی، ایثار اور خود اعتمادی کے جوہر موجود ہیں۔ اسے اپنے عوام پر اعتماد اور فتح کا یقین ہے۔ اور ان خوبیوں کا اس نے ہر موقع پر ثبوت دیا ہے۔

کسلیا توٹ کے دستے کو حکم دیا گیا کہ وہ پہاڑی (M) پر قبضہ چالیں کیوں کہ اسکی بڑی اہمیت تھی۔ اور اس پہاڑی کو ہر امکانی کاوش سے پہچانا تھا۔

”اپنے ارادے اٹل رکھو“ کسلیا توٹ سے کہا گیا۔ آخری کار توں اور آخری خطرہ خون تک — پہاڑی کا ہمارے عمل دخل میں رہنا ضروری ہے۔

اس نے سادگی سے جواب دیا۔ ”پہاڑی پر ہمارا قبضہ باقی رہے گا۔ — کامریڈ کمانڈر“

دستہ چڑھائیوں کی طرف بڑھا۔ وہ بروقت پہنچ گئے اور اسی سمئے فاشسٹ سپاہیوں کی ایک لفٹ کہنی بھی آگئی اور پاس کی پہاڑی سے اترتے ہوئے وہ پہاڑی این M کی طرف بڑھے۔

کسلیا توٹ کے چٹانوں کے پیچھے ہو جانے کا حکم دیا جنگجوؤں نے تعمیل نہی اور بند دقوں کے گھوڑے چڑھنے لگے۔ ”جلدی نہ کرو“ کسلیا توٹ نے کہا۔

وہ خاموش تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سنگین لڑائی اور دہشت خیز مقابلہ ہو گا اس نے دیکھا کہ مکرانے والی قوتیں مساوی نہیں لیکن پھر بھی اسے کوئی خوف نہ تھا۔ بلکہ یقین تھا کہ پہاڑی محصور نہیں کی جاسکتی اور انتہائی کٹھن وقت میں بھی کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آئے گی۔

اس نے سنجیدگی سے کہا ”تمہیں حکم ہے کہ پہاڑی کو محصور نہ ہونا چاہئے۔“

تمہاری جان کے لائے پڑ جائیں لیکن پہاڑی پر قبضہ رہے۔ کیا تم سن رہے ہو؟

جنگجوؤں نے دوستانہ لہجہ میں کہا ”پہاڑی پر ہمارا ہی قبضہ رہے گا“ وہ کمانڈر سے اُٹس رہتے تھے اور اسکی جوانی اور کم عمری کے باوجود اس اعتماد تھا۔ سینئر سارجنٹ کی موجودگی نے ان میں جوش اور اتحاد کی روح پھونک دی۔  
ڈھلانوں پر فاشستی سیاہ تو د نظر آ رہے تھے۔

جرمنوں نے توپیں اور مشین گن چلانے شروع کئے اور جنگ کے مہیب شعلے بھڑکنے لگے۔ پہاڑی ساکت تھی۔ ”مجھلت نہ کرو“، ایک بار اور کسلیا قوت نے دستے کو سمجھایا۔ اپنی تیاریوں کو مکمل سمجھ کر انھوں نے حملہ شروع کر دیا تھا۔  
لیکن پہاڑی پُرسکون تھی۔

نازیوں کو قریب پہنچنے کی مہلت دیکر جب وہ چند قدم فاصلہ پر رہ گئے تو کسلیا قوت نے گرج کر کہا۔ ”اب دقت ہے۔ فائر کرو“ انسانی جسم پہاڑی ڈھلانوں پر لڑھکنے لگے۔ فاشستوں میں انتشار پھیل گیا۔ زخمی کرائے گئے اور جرمن سپاہی سر اسیمہ ہو گئے۔ کچھ پیچھے بھاگے تاکہ اپنے افسروں کے ارادوں سے آگاہ ہوں۔  
کسلیا قوت نے دانت میس کر کہا ”اور فائر کرو اگر یہ حملہ ان کے

لئے ناکافی ہے۔“ نصف فاشٹ کمپنی کے قدم اکھڑ گئے اور وہ نیچے لڑھکتے لگے۔ پہلا حملہ کافی تھا لیکن ایک اور حملہ ہوا۔ جرمن ان چند سرخ جانبازوں کو محصور کرنے کے لئے کوشاں تھے۔ لیکن دونوں طرف سے ایک دہشت خیز مقابلہ جاری رہا۔ انہوں نے پھر ایک کوشش کی اور ناکام رہے۔ ”یہ حوصلہ۔ اے خونیں کتو!“ کسلیا قوت نے مطمئن ہو کر کہا۔ لیکن غیر متوقع طور پر اسے بتلایا گیا۔ ”تمام کارتوس ختم ہو گئے“ وہ بیدگہر گیا۔ اسے معلوم تھا کہ فاشٹ کمپنی پہاڑی پر چڑھنے کی پھر کوشش کرے گی۔ اسکی بھوئیں سکر گئیں اور حکم دیا۔ ”اپنے بلب تیار رکھو“

چٹانوں کے درمیان مشین گن رکھ کر اس نے چیلانی شروع کی۔ جرمنوں نے ڈھلاؤں پر چڑھنے کی ایک اور کوشش کی۔ دستی بمب پھینکے جانے لگے۔ آگ کے دھکتے ہوئے شعلوں سے گھیرا کر وہ پھر لوٹے لگے۔

ایک گھنٹہ گذرا۔ دوسرا گھنٹہ گذرا۔ لیکن لڑائی بدستور جاری تھی۔ برابر کی ٹکر تھی لیکن شدید اور خطرناک۔ یکایک کسلیا قوت سے کہا گیا۔

”دستی بمب بھی ختم ہو گئے“

کسلیا قوت نے پلٹ کر جنگجوؤں کو دیکھا پھر ایک بار اس نے اپنی اور دشمن کی قوت کا اندازہ لگایا اور فیصلہ کیا کہ اگر اور کارتوس نہیں۔

بند دقتیں دشمن کے حملوں کا جواب نہیں دے سکتیں اور مہم بھی ختم ہو گئے ہیں تو ضروری ہے کہ جنگجوؤں کو بچالیا جائے ان زندہ قوتوں کو اپنے کامریڈز اور دوستوں کو اور اس نے انہیں چلے جانے کو کہا اس نے دوبارہ حکم دیا "چلے جاؤ"

ایک افسر کو خاریوں اور زانوں کا کچھ دیر اسکے ساتھ رہے۔ ان کے ہاں کچھ کارٹوس بچ رہے تھے۔ ان تین جانباڑوں نے دشمن پر حملہ جاری رکھا۔ ناشستیوں کے قوت قریب ہوتے نظر آ رہے تھے اور کچھ لڑھک کر غائب ہو گئے لیکن دوسرے لمحہ وہاں اور موجود تھے۔ آہستہ آہستہ سیاہ قودوں کی ایک لائن چڑھتی دکھائی دی کیا پہاڑی واقعی محصور ہو جائے گی؟

نہیں! کسلیا قوت ایک لمحہ کے لئے بھی ایسا نہ سوچ سکتا تھا۔ اس نے مدافعتی کارروائی جاری رکھی اور دشمن پر کاری ضربیں پہنچاتا رہا۔ کو خاریوں اور زانوں کا فائر کرنے لگے لیکن بہت جلد ان کا عقوڑ اس اسٹاک ختم ہو گیا اور وہ کی طرح بھی اپنے کمانڈر کی مدد نہ کر سکتے تھے۔ بے بس ہو کر وہ لیٹ رہے۔ کسلیا قوت نے انہیں بھی چلے جانے کا حکم دیا۔

اب وہ تنہا رہ گیا تھا۔ ستر یا اسی یا بہت ممکن ہے کہ سو، ناشستیوں کے مقابلہ میں وہ مردانہ دار دشمنوں کے حملوں کا جواب دیتا رہا۔

دشمن کی چار توپیں لگاتا رہتے لگیں۔ اس پہاڑی کی تنہا مدافعت کرنے والے پر۔ لیکن کسلیا قوف ابھی تک محفوظ تھا۔ اچانک اسکے پیر پر ایک شل گرا۔ کسلیا قوف نے کہا "اب خاتمہ ہے" لیکن وہ بے ضرر ثابت ہوا اور اس نے پھر مقابلہ جاری رکھا۔ کسلیا قوف کی مشین گن مسلسل فائر کر رہی تھی اور فاشتیوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی اسکے ذہن میں صرف یہ خیال تھا کہ پہاڑی کو دشمن کے ہاتھوں میں نہ جانے دیا جائے اور وہ پورے انہماک اور جوش سے جارحانہ حملہ میں مشغول تھا۔ یکایک اسے معلوم ہوا کہ مشین گن اپنا فرض تمام کر چکی ہے۔ اس خیال سے کہ وہ دشمنوں کے کام نہ آئے اس نے مشین گن کو چٹاؤں میں کہیں چھپا دیا گو مشین گن اب ناقابل استعمال تھی لیکن ابھی اسکی رائفل باقی تھی۔ غیر ضروری عجلت سے کام نہ لے کر وہ اب سنبھل سنبھل کر ٹھیک طور پر فائر کرنے لگا۔ انھوں نے بیچہ کوشش کی کہ کسلیا قوف کو گھیر کر زندہ گرفتار کر لیا جائے لیکن بے سود۔ یکے بعد دیگرے فاشت سرد پتھروں پر گرنے لگے۔ جو کوئی بھی ذرا آگے بڑھنے کی کوشش کرتا اسے موت کے سپرد ہونا پڑا سیزر سار جنٹ کی نظریہ تیر تھی۔ آخر کار، کارٹوس بھی ختم ہو گئے اور رائفل نے مشین گن کا اتباع کیا اب کسلیا قوف کے پاس پانچ یا چھ دستی بمب رہ گئے تھے۔ کیا کیا جاوے کیا بچھے ہٹنا ہو گا؟ اسے کمانڈر کا حکم یاد آگیا۔ آخری سانس تک پہاڑی پر قبضہ رکھنا ہے۔ اسکے معنی ہیں کہ اسے آخری کارٹوس اور آخری بمب

تک لڑائی جاری رکھنی ہوگی۔

لیکن ان باقی ماندہ بموں کے علاوہ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ مدافعتی حربوں میں سے اب کچھ بچ نہ رہا تھا۔ اور کوئی راستہ بھی نہ رہ گیا تھا۔ لیکن صرف ایک — اور کسلیا توٹنے سے پالیا۔ جب کہ جرمن ابھی نیچے تھے اس نے یہ عجلت تمام اپنے مردہ کامریڈز کے جیب ٹوٹے جس سے اسے کچھ کارتوس حاصل ہو گئے۔ اس کے یہ معنی ہوتے کہ مدافعت کے لئے ابھی کچھ اور موقع ہے تاکہ دشمنوں کو غارت کیا جاسکے۔

اس بے خوف بہادر نے اپنی رائفل سنبھالی۔ وہ تنہا تھا۔ بالکل تنہا لیکن پہاڑی پہلے کی طرح بدستور ابھی دشمنوں کے قبضے میں نہیں گئی تھی۔ آخر کار اس نے اپنا آخری کارتوس استعمال کیا۔ ذلیل فاشستہ درندے پہاڑی کے بالائی حصہ سے ابھی دس یا پندرہ گز دور تھے کسلیا توٹنے کی رائفل خاموش ہو گئی اور اس کے چہرے پر موت کے آثار جھلکنے لگے۔ اس کے پاس ابھی ایک حربہ باقی تھا۔ اس لڑائی کا فیصلہ کن ہتھیار — اس نے چلا کر کہا "پلاٹون حملہ کرنے میں میرا اتباع کرو"

ایک آخری جرات آمیز اقدام جس میں زندگی کا خطرہ ہو۔ مادر وطن کی غیرت کا آتشیں احساس اور پرچم جذبہ جو امردی، روسی جاننا بڑا اور اعلیٰ فوجی استعداد کے بے خون مظاہرہ پر مبنی تھا۔

اس حملہ نے دشمنوں کے اوسان قطع کر دیئے ان پر ایک جادوئی اثر ہوا اور ہر کوئی گھبرا کر پیچھے ہٹنے لگا۔ اسی لمحے میں جرمنوں کی سمت میں

نیچے آگ پھیل رہی تھی۔ کسلیا قوف نے نظریں دوڑائیں۔ دیکھا کہ خود اپنے آدمیوں کی ایک جماعت دشمنوں پر ٹوٹ پڑی تھی۔  
 ”ہیرا“ کی صدا نیچے سے سنائی دی۔ ”ہیرا“ کسلیا قوف فاسحانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

جو من ہر چیز چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ بندوقیں، مشین گن، کارٹوس، ہر چیز۔ اور نصف کمپنی نے جو پہاڑی پر قبضہ کرنے آئی تھی گراں بار نقصان برداشت کیا۔

پہاڑی پر ہم ہی قابض رہے۔ حکومت نے کسلیا قوف کو اس بہادر بے خوفی اور متحیر کن کارناموں کے صلہ میں ”سوویٹ یونین کا ہیرو“ کے خطاب سے سرفراز کیا۔



# ”ماں“

”چلو ہم اس سے مل آئیں“ ماں نے کہا۔ اور اسکی لڑکی اولنگا سمجھ گئی کہ ماں کا اشارہ کس کی طرف ہے۔ وہ اپنے لڑکے سے متعلق کہہ رہی تھی۔ بورس رضا کار جو اولنگا کا بھائی تھا۔ اس کو مطلع کیا گیا تھا کہ وہ اپنے ادارے کے تمام ساتھیوں سمیت فرج میں جانے والا ہے۔ ماں اسکے مقابل کھڑی تھی۔

”لیکن تمہاری نظریں کمزور ہیں اور جسمانی حالت بھی ٹھیک نہیں“ اس نے اعتراض کیا ”کیا تمہیں اسکی فکر نہیں“

”کوئی پرواہ نہیں ماں“ بورس نے جواب دیا۔  
 تم نے اس سے پہلے جنگ میں کبھی شرکت نہیں کی اور تمہیں دقتیں پیش آئیں گی“ ”کوئی پرواہ نہیں ماں“ اس نے بے پرواہی سے اپنا جملہ دہرایا اور سامان سمیٹا رہا۔

کئی بار اولنگا اور ماں اس سے ملنے گاؤں جاتے رہے جہاں وہ تربیت حاصل کر رہا تھا۔ وہ ورزش سے واپس ہوتا، تھکا ماندہ،

گرد آلود اور مضمحل اور وہ سٹیٹے اپنے شہر، دوستوں، ملاقاتیوں اور رشتہ داروں کی باتیں کرتے انہوں نے جنگ سے متعلق کبھی کوئی بات چیت نہیں کی کیونکہ ان کے ارد گرد ہر چیز اس سے متاثر اور جنگ آلودگیوں سے ملوث تھی۔

اولگاکا ایک نوجوان لڑکی تھی اور یہ ملاقاتیں اسکے لئے ایک تفریحی حیثیت رکھتی تھیں جیسے وہ تعطیلات میں شہر کے اطراف و اکناف دیہاتوں میں پھرا کرتی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں میں ان گنت پھول سنبھالے سرشام برقی ریل سے واپس ہو جاتے جب کہ شہر تاریکیوں کی آغوش میں جنگ کی دہشت کے باعث سہما ہوتا۔

مخاد قریب تر ہو رہا تھا اور اولگاکا کچھ ہراساں تھی۔ آج وہ اپنے بھائی سے کس طرح مل سکے گی جبکہ حالات بالکل ناسازگار ہوں اور اتوار کے دن بورس سے ملنا ضروری تھا۔ وہ کھیتوں سے ہوتے ہوئے گزرے جو خزاں کے باعث عریاں پڑے تھے ان کی مخالف سمت گاڑیاں اور ٹرک چل رہے تھے۔ سڑک پناہ گزینوں سے کچھا کچھ بھری تھی اور ان کے بچے سامان سے لدے چلے آ رہے تھے۔ ایک مردہ گھوڑا آسمان کی جانب پیراٹھا پڑا تھا اور کہیں پاس ہی سرخ فوج گزری تھی جسکی سلسل آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ان کے ارد گرد کی ساری چیزیں نامافوس اور اجنبی تھیں، باڑیں لٹی ہوئی تھیں اور کسی خطرہ کی پیش گوئی کر رہی تھیں۔ میدان میں جھاڑیوں

نیچے سرخ سپاہی مشین گنیں لے چھپے بیٹھے تھے۔ جب وہ پہلے گاؤں میں داخل ہوئے تو وہ تباہ شدہ تھا۔ بالکل ویران کہ ایک پالتو جانور بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ چمنیوں سے دھواں نہ اٹھتا تھا اور مکاؤں کے آگے ازکار رفتہ فرنیچر بڑا تھا۔ اس پڑھوں خاموشی کے باوجود اولگکا اپنی ماں کے پیچھے بڑھی جا رہی تھی جو ثابت قدمی سے اپنا راستہ طے کر رہی تھی۔

دوسرا گاؤں شعلوں کی زد میں تھا۔ جب انہوں نے کسی قدر بلندی پر پہنچ کر دیکھا تو وہیں رک گئے۔ آگ کے شعلے چھتوں پر نارج رہے تھے۔ کئی جھونپڑیاں جل کر راکھ ہو گئیں یہ ایک پریشان کن و ترسناک انگیز منظر تھا۔ اولگانے ماں کو پیچھے گھسیٹ لیا لیکن اس نے متانت سے کہا "ہمیں آگے بڑھنا چاہیے" اور وہ جلتے ہوئے مکاؤں کے درمیان راستوں سے گزرنے لگے۔ اولگکا دریاؤں میں دیکھنے لگی جہاں شعلے لہرا رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ ایک پردہ جل رہا ہے اور کھر کی کے سیاہ شیشوں کے پیچھے آگ دکھائی رہی تھی۔ یہ کوئی خواب تو نہیں! اس کا ایک ماٹوس گھاٹوں آج کچھ عجیب مناظر پیش کر رہا تھا۔ پہاڑیاں درختوں سے ڈھکی ہوئی تھیں اور ان کے پیچھے نیلا اور سیاہ دھواں ————— بائیں جانب کہیں سے بندو قوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ گاؤں پہنچ کر جب وہ ایک اکھوٹے درختوں میں داخل ہوئے تو ان کی راہ میں ایک گائے پڑی تھی جسکی گندنی رنگ کی پٹیوں پر سیاہ مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں وہ راستے کے بچوں پہنچ پڑی

تھی۔ اور اس سے کچھ فاصلہ پر ایک ٹوٹی ہوئی گاڑی۔ قریب ہی ایک آدمی کی لاش تھی جس پر کچھ کوڑوں جیسے نشان تھے۔ ایک آنکھ کسی سیاہ مادہ سے ڈمکی تھی اور دوسری کھلی ہوئی یہ منظر اتنا بھیانک تھا کہ اد لگا خوف سے ہم گر رہ گئی۔

وہ اس منظر کو پیچھے چھوڑ کر نکل گئے اور انہیں چھٹی ہوئی سیٹی کی ہی آواز سنائی دی۔ ماں رگ گئی اور اپنا سر جھکا لیا اور لگانے اسکی پیروی کی۔ گودہ جانتے تھے کہ وہ غلطی پر ہیں۔ انہیں لیٹ جانا چاہئے اور اپنے چہرہ کو چھپا لینا لیکن انہیں پوسکی تلاش تھی اور اس طرح اگر وہ رکتے رہتے تو پھر اس سے ملنا ممکن ہی نہ تھا۔

مٹی کے ٹیلے کے پیچھے ایک بسبکے پھٹنے سے دھماکا ہوا اور پھر دوسرا اس گاڑی اور لاش کے قریب — لیکن وہ آگے بڑھ چکے تھے۔ تب وہ بھاگنے لگے اور لگا کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ اور قدم کچھ تھکے تھکے سے تھے لیکن وہ بھاگتے رہے۔ اور لگا کے ذہن میں خیالات کا ہجوم تھا۔ ”وہ ہمیں آزار نہیں پہنچائینگے۔ انہیں ایسا نہ کرنا چاہیو“ وہ گاؤں جہاں بورس زیر تربیت تھا مسخ ہو چکا تھا اور صرف سیاہ ستون جھلے ہوئے میدان کی نگرا نی کر رہے تھے۔ درخت تک نڈر آتش ہو چکے تھے۔ ”ماں“ اور لگانے کہا۔ ”اب ہم کہاں جائینگے“ ماں خاموش کھڑی تھی۔ اور اس پست قامت شکاری ہاری بڑھیا پر اسے رحم آنے لگا۔ ”ماں“ اس نے دوبارہ کہا۔ ”چلو ہم چلیں

تم دیکھتی ہو آگے جانے سے کچھ حاصل نہیں۔“  
 ”کچھ دور اور چلو“ ماں نے جواب دیا ”ہم دریافت کرینگے۔“

انہوں نے پھر میدانِ کارخ کیا اور ان تاراج دیہاتوں سے گزرنے لگے۔ بہر طرف — گھاس پر اور خندقوں میں انہوں نے سرخ سپاہی دیکھے جو بائیں جانب متوجہ تھے۔ تین سرخ سپاہی ایک طرف سے آتے دکھائی دیئے۔ ماں دوڑ کر ان کے پاس گئی اور ایک دراز قامت سپاہی سے مسرت آمیز لہجہ میں کہا ”اگر میں غلطی پر نہیں تو تم پال ہو۔“ سپاہی کچھ دیر تک بھٹی بھٹی آنکھوں سے اس مختصر سی عورت کی طرف دیکھتا رہا۔ اور اس نے پھر سنبھل کر کہا۔

”تم بورس کی ماں ہو۔۔۔ کیوں ہے نا“

”ہاں میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں وہ کہاں ہے۔“

”کہاں ہے“ پال نے دہرایا ”اس پہاڑی کی طرف سیدھی چلی جاؤ لیکن تمہارا وہاں جانا بہتر نہیں اسے پانا مشکل ہو گا۔ اور پھر۔۔۔“  
 وہ یکا یک مسکرا دیا

”کیونکہ وہاں حملہ جاری ہے اور ہم محصور ہو گئے ہیں۔ لیکن تم یہاں گھومنے کیسے چلی آئیں“

”میں گھومنے نہیں آئی“ ماں نے جواب دیا۔ ”مجھے بورس سے

ملنا چاہئے۔“ اس نے یہ جملہ کچھ اتنے متاثر کن انداز میں کہا کہ پال (جو اسی ادارہ سے آیا تھا اور اسی بٹالین سے تعلق رکھتا تھا جس سے کہ بورس)

صرف اتنا کہہ سکا " اچھا جاؤ "۔

ماں لامبی لامبی گھاس پر بیٹھی تھی اور اسکے ذیب ہی اولگا ایک سرخ سپاہی نے اس میدان کی طرف اشارہ کیا جہاں گھاس اگی ہوئی تھی۔ میدان سے پرے ایک جنگل تھا اور اس کے پرے ایک پہاڑی پر گاؤں نظر آ رہا تھا۔ ہماری ایک بیٹری اس گاؤں پر بمباری کر رہی تھی۔ اور جرمن اس میدان پر۔۔۔ جہاں اولگا اور اسکی ماں بیٹھے تھے۔

" انہوں نے ابھی ابھی حملہ شروع کیا ہے۔ تم چاہو تو یہاں ٹھیر سکتی ہو ورنہ تمہاری مرضی " سرخ سپاہی نے کہا۔ " کیا تم بوس کو جانتے ہو " مان نے دریافت کیا۔

" ہاں۔۔۔ وہ حملہ میں مصروف ہے "۔

" وہ کیسے لڑ سکتا ہے "۔

" کیوں کیا وہ بزدل ہے "۔

اور لڑ کے نے جو ایک کسان طالب علم تھا اپنے کندھے پھڑکاتا کہنا شروع کیا " اگر وہ بزدل ہوتا تو ہم اسے اپنی کپنی میں شرکت کی اجازت کبھی نہ دیتے "۔

دونوں خاموش ہو گئے اور بغیر کچھ کہے سنے وہ اس پہاڑی گاؤں کی طرف دیکھنے لگے جو شعلوں میں لپٹا ہوا تھا۔ درختوں کی وجہ سے آدازیں گونج رہی تھیں۔ لیکن واضح طور پر کچھ نہ سنائی دیتا تھا۔ آگ کے باعث جنگل جگمگا رہا تھا۔

ماں اٹھی اور پہاڑی کے دامن کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ اپنے بیٹے سے ملنے کی تمنی تھی وہ اپنے لڑکے کو اس جنگل میں ڈھونڈنا چاہتی تھی جہاں جنگ ہو رہی تھی اسکی خواہش تھی کہ بوس کو گاؤں کی سمت رائفل لیکر وڑتا ہوا دیکھے۔ وہ کچھ دیر کے لئے رک گئی اگر اولگا کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ اس کی ماں مذہبی نہیں تو وہ یہ سمجھنے پر مجبور تھی کہ ماں دعا مانگ رہی ہے اس نے اولگا سے کہا ”اب ہمیں چلنا چاہئے“ اور بغیر کسی اور طرف نگاہ کئے وہ بڑھنے لگی۔

”کیا تم اسکا انتظار نہ کرو گی؟“ سرخ فوجی چلایا۔  
 ”نہیں۔۔۔ تمہاری عنایت کا شکریہ۔۔۔ ہمیں چلنا ہو گا اولگا“  
 اور وہ سڑک پر پہنچ گئے۔ ”اولگا۔“ ماں نے کہا ”تم تھک گئی ہو میری بیٹی“  
 ”نہیں ماں، لیکن مجھے ڈر ہے کہ ہم زندہ نہ بچ سکیں گے۔ مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے“

ماں کے خشک ہونٹوں پر ایک پتلی سی مسکراہٹ کی لہر دوڑ گئی۔ ”ہمیں کچھ نہ ہو گا اولگا“ اسنے کہا اور قدرے توقف کے بعد وہ کہنے لگی۔  
 ”اب مجھے کچھ سکون سا محسوس ہو رہا ہے میں سمجھتی تھی کہ اسکا جسم اور آنکھیں اتنی کم زور ہیں کہ وہ جنگ میں حصہ نہ لے سکیگا۔ لیکن یہ معلوم کر کے اطمینان سا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ بھی دوسروں کی طرح جنگ میں مصروف ہے۔ اب ہمیں گھر چلنا چاہئے۔ تمہارات کی ڈیوٹی بجالانی ہے۔ اور کھر پونختے پونختے شام ہو جائیگی۔“  
 اور وہ چھوٹے چھوٹے، ہلکے ہلکے سیدھے قدم ڈالتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

## ”خاندان“

”ایک منٹ کے لئے ادھر آؤ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے“ سمیوں نے یونچ

نے کہا

دشا اپنے شوہر کی طرف اس طرح بڑھی جیسے وہ اس جوڑے  
سینے والے آدمی کو پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ اور اسکی اداس آنکھیں  
جو مدت سے مسکرائی بھی نہ تھیں۔ اس نے اپنے ہاتھ صرافت کے  
ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔ ”تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو مجھے معلوم ہے“  
”نہیں۔۔۔ تمہیں کس طرح معلوم ہوا؟“

”میرے دل نے محسوس کیا۔۔۔ اچھا تم ہی کہو کہ کیا کہنا ہے“

”دروازہ بند کر دو۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ علیا بیٹھنے“

”علیا پانی لینے گئی ہے۔ میں تم سے وہ سب کچھ کہتی ہوں جو تم کہنا چاہتے  
ہو۔ اگر میں کوئی غلطی کروں تو تم بتا دینا۔ کاستیا کی موت کے بعد

سے تم جو کچھ کر رہے ہو میں اس سے واقف ہوں۔ ہاں۔۔۔  
یعنی گراؤ قومی حفاظت کرتے ہوئے کاستیا نے ایک اچھی اور باعزت

موت پائی۔ ہمیں اس کا بدلہ لینا ہے۔ ہر روز ہر گھڑی — ادھ !  
 وہ بد معاش۔ کیلئے۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں نہایت دہشت خیز اور  
 ہیتناک ہے۔ میں ان سے نفرت کرتی ہوں۔ تم اپنے بھائی کا سیتا  
 کا انتقام لینا چاہتے ہو۔ تم فوج میں شریک ہو کر سورجہ پتر جانا  
 چاہتے ہو — بے ناہ سیمون ایونیوچ نے اٹھکر اپنی بیوی کو  
 لپٹا لیا اور ہوسہ دیکر کہنے لگا —

”دشا تم بڑی سمجھدار عورت ہو۔ تم نے ٹھیک سمجھا اس کے سوا  
 میں اور کر ہی کیا سکتا تھا۔ میں نے درخواست کی خانہ پری کر دی  
 ہے سرخ فوج میں ایک اور سیاہی کا اضافہ ہو گا۔ میں بہکون  
 سے کام نہیں کر سکتا میرا خون کھول رہا ہے۔ اب مجھ سے غالی نہیں  
 بیٹھا جاتا۔ میں اب بوڑھا ہوں لیکن بھلی جنگ میں شریک رہ  
 چکا ہوں اور مجھے اب تک یاد ہے کہ بندوق کس طرح چلانی جاتی  
 ہے۔ میرے پاس وقت کم ہے تم مجھے سامان باندھنے میں مدد  
 دو“

دشا گھڑکی کے قریب پہنچی اور جھانکنے لگی کہ کہیں علیا تو  
 نہیں آ رہی آج تعطیل کا دن تھا۔ گلی کچھ بھری تھی۔ سڑک  
 پر سواریاں نہ تھیں بلکہ لوگ پاپیادہ ہی جا رہے تھے اور اکثر  
 جلانے کی لکڑیوں اور پوروں سے بھری ہوئی گاڑیاں کھینچ رہے  
 تھے۔ کچھ گاڑیوں پر بوڑھے مرد اور عورتیں سٹال اور گلو بند

لیٹے بیٹھے تھے۔ پیپوں، ڈبوں اور بالیٹوں میں پانی جا رہا تھا۔ چار سو کھرا چھایا ہوا تھا ہوا کے سرد جھونکے چل رہے تھے اور برف اُدھر اُدھر کبھر رہا تھی۔ ہر شخص سیاہ رومال سے اپنا منہ لپیٹے لقاب پوش دکھائی دیتا تھا۔

دشاکچھ دیر تک اس متحرک مجمع کی طرف دیکھتی رہی۔ نقابوں پر سانس کی وجہ سے برف کے نقش و نگار بن رہے تھے اور ان کے منہ سے بھاپ نکل رہی تھی اس ہیب انسانانی سیل میں طلیا کو ڈھونڈ نکالنا بہت مشکل تھا۔ وہ آئی تھی ہوگی۔

”بچہ بھی کچھ کہنا ہے“ کھر کی کی طرف سے پلٹے ہوئے دشانے کہا ”میرا ارادہ ہے کہ میں اب تمہاری جگہ سنبھال لوں۔ میری بات میں دخل نہ دو اور جو میں کہوں سنتے جاؤ۔ ہمارا شہر گھر ہوا ہے اور لوگ بڑی تکلیف میں ہیں۔ شہر محاذ بن چکا ہے۔ یہ اخباری اطلاعات ہیں اور درست بھی۔ اور اس حالت میں جبکہ تم اپنے بھائی کا انتقام لینے مار رہے ہو میں تمہاری جگہ کام کر لوں گی۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں مجھ میں قوت ہے سمجھ ہے پھر یہ کام مجھے پسند بھی ہے یقین مانو تمہیں اپنی بیوی کی وجہ سے کسی قسم کی شرمندگی یا خفت نہیں اٹھانی پڑے گی۔ مجھے فرض کا احساس ہے۔ کارخانہ تو میں نے بچوں کی خاطر چھوڑا تھا“

” اور اب بھی یہی وجہ ہو سکتی ہے “

” کیا وجہ ؟ “

” یوٹیا ابھی کمسن ہے اور علیا صرف بارہ برس کی ایک نازک لڑکی  
اگر ہم دونوں چلے جائیں تو گھر کا کیا ہوگا۔ ہمارا امکان تباہ و برباد  
ہو جائے گا کیا تم نے اسکے متعلق بھی سوچا “

” ہاں میں نے اچھی طرح سوچ لیا ہے “ میں بچوں کو پورا خوفناک  
بھیج دوں گی وہاں ایک بڑھیا میری دوست ہے اور اس کے  
بھی اسی عمر کے بچے ہیں۔ وہ میرے بچوں کی دیکھ بھال کر لے گی اچھا  
اب گھریلو باتوں پر زیادہ سوچنے کا وقت نہیں پھر دشمن بھی تو  
ہمارے گھر برباد کر رہا ہے۔ ہمیں لڑنا ہے اب ہم ہاتھ پر ہاتھ دہرے  
نہیں بیٹھ سکتے ہماری مدد کوئی نہیں کرے گا اگر ہم نے خود اپنی مدد نہ کی  
ہے نا سمیون ؟ “

” تم سچ کہتی ہو “ سمیون ایو نوچ نے کہا۔

علیا پانی رسوئی میں رکھ کر کمرے میں داخل ہوئی اور اپنے نغصے  
ہاتھ جو سردی کے باعث نیلے پڑ گئے تھے انکٹھی پر پھیلا دیے کسی نے  
اسکی پیٹھ پر ہاتھ سے ٹپو کا دیا۔

” ہاں — تمہیں آج کیا ہوا ہے ؟ کیا کچھ حادثہ ہو گیا۔ کوئی اور  
مارا گیا — مجھے بتاؤ مان — مجھ سے نہ چھپاؤ — “

” میں تم سے کچھ نہ چھپاؤں گی “ دشانے کہا ” غور سے سنو کہ ہم نے

کیا فیصلہ کیا ہے" اس نے ایک گہرا سانس لیا اور رک رک کر ایک ایک لفظ ادا کرنے لگی۔ "تمہارے ابا مورچہ پر جا رہے ہیں اور میں کارخانے میں انکی جگہ لینے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تم لوگوں کو تمہاری خالہ "لالیا" کے پاس پور و خو فیا بھیج دیں۔ بس یہی"

علیائے گنجھی میں کونکے ڈالے نہ تم شعلوں کی طرف نکلتی رہی بغیر اٹھائے اس نے دریافت کیا۔ "لیکن میں اور پوٹیا، پور و خو فیا کیوں بھیجے جا رہے ہیں"

"میری لادٹی! تمہاری دیکھ بھال اس گھر میں کون کرے گی۔ روٹی کے لئے گلی میں کون ٹھہرے گا۔ آگ جلانے کی ٹکڑیاں اور پانی کون لائے گا۔ پوٹیا کو کون سنبھالے گا۔ کوئی اسکی نگہداشت کرنے والا چاہئے؟ وہ یوں تو نہیں چھوڑی جاتی اور جب میں نہ رہوں تو یہ سب کون کرے گا۔"

"ماں ہم پور و خو فیا نہیں جائیں گے میں خالہ لالیا کو پسند نہیں کرتی وہ بڑی چرچر دی ہیں۔ کیا گھر کی دیکھ بھال میں ہمیں کر سکتی ہیں۔ غصہ سے اسنے اپنا ٹوٹ اتارا اور اعتماد بھرے لہجے میں کہنے لگی

"کیا اب میں گھر بار نہیں سنبھال رہی ہوں؟ کیا میں پانی نہیں لاتی مجھے معلوم ہے کہ جلانے کی ٹکڑیاں کہاں ملتی ہیں۔"

الو الو ، میری مدد کرے گی میں پکانا جانتی ہوں اور الو الو  
 اور میں گلی میں روٹی کے لئے جائیں گے ہم اب بچے نہیں  
 رہے آپ دونوں جا سکتے ہیں — ہماری فکر نہ کیجئے آپ  
 روز گھر آیا کر سکی اوہ ! — خیر آجکل یہ تو بہت مشکل ہے۔  
 میری ماں آپ پریشان نہ ہوں ہم سب کچھ سنبھال رہی —  
 جاؤ ماں

# عینی مشاہدے

کچھ روز قبل، یہاں سے قریب ہی میں نے تین پارٹی زان جنگجوؤں سے گفتگو کی جو پہاڑیوں جنگلوں اور دلدلوں سے اپنا راستہ بناتے ہوئے جرمن لائن سے دور اسمولنک کے علاقہ سے سرخ فوج اور آزاد روس کو واپس ہو رہے تھے۔ وہ سب لڑکیاں تھیں، پانچا جسکی عمر اکیس سال تھی۔ لیزا کی پچیس سال اور کنیا کی تیس۔ وہ تینوں اپنی رپورٹیں پیش کر کے واپس جانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔

”تم ایک پارٹی زان کس طرح بن گئیں“ میں نے ایک تو انا لڑکی سے دریافت کیا جس کی آنکھیں کشادہ اور گال گلابی تھے۔  
 « ایک باصحت لڑکی اور کیا کر سکتی ہے؟ جرمنوں کے تحت خوشگوار زندگی گزارنا ناممکن ہے ان دنوں اگر ایک نوجوان عورت دیہات میں ٹہر جائے تو اسکے یہ معنی ہیں کہ وہ فحاشی کے لئے آمادہ ہے اور اس نے جرمنوں کی غلامی کا طوق قبول کر لیا۔ ہر روز جنگلوں میں

متعدد عورتیں ہم سے آملتی ہیں“

یکے بعد دیگرے گاؤں مسخ ہو رہے ہیں۔ جہاں کہیں بھی پارٹی زان حملہ آور ہوتے ہیں اس پاس کے مقامات کو یہ سمجھ کر کہ انہیں یہاں سے امداد ملی ہے تیار کر دیا جاتا ہے۔ بورٹھے اور بچے گلیوں میں یہ کہہ کر چھوڑ دیئے جاتے ہیں کہ ”جہاں جا ہو چلے جاؤ یہ ہمارا کام نہیں کہ تمہارے لئے مکانات فراہم کریں“ اسمولنسک کے اطراٹ پچاس کلومیٹر تک تقریباً تمام دیہات جلا کر خاکستر کر دیئے گئے۔

”دیہاتی خندقوں میں پناہ گزین ہیں“ اس نے بتایا ”وہ خاندان ہیں اور ان کے سینکڑوں بچے بھوک کا شکار ہیں“ کتنے روج فرسا مناظر۔۔۔ وہ لکڑی کے برادے سے روٹی بناتے ہیں اور جب جرمن دیہات پہنچتے ہیں تو ان روٹیوں کو دیکھ کر دیکھ کر قہقہے لگاتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ دیکھو روسی لوگ روٹی کسے کہتے ہیں۔ گذشتہ سال اسمولنسک کے قریب تھوڑی سی زمین پر کاشت ہوئی تھی۔ اور اس سال بھی کافی زمین بریکار پڑی ہے۔ یہاں زندگی کے برقرار رکھنے کا ایک ہی ذریعہ ہے۔ شکار۔۔۔ جرمنوں کا شکار“

”کیا تم نے کبھی خود کسی آدمی کو مارا ہے پانیا؟“

”آدمی!۔۔۔ غالباً نہیں البتہ میں نے چند نازیوں کو مارا ہے“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ تم نے انہیں مارا“

”میں نے ان پر فائر کئے اور انہیں گرتے دیکھا۔ پھر میں نے ان کی ٹاشیں

دیکھیں“

” اور بعد میں تم نے کیا محسوس کیا“

” مجھے بھلا معلوم ہوا۔ کیونکہ میں ایک لڑکی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ انہوں نے ہمارے شہر قصبے اور حسین عمارتیں برباد کی ہیں جہاں نوجوان زندگی سے لطف اندوز ہو رہے تھے مجھے فخر ہے کہ میں نے ایک لڑکی ہوتے ہوئے بھی ان کی راہ میں آفتیس کھڑی کر دیں“

یہ ایک میں نے پانیا کے پیچھے روس کی ساری جوان نسل کا ایک طویل سایہ دیکھا۔ ساٹھ سے ستر لاکھ تک لڑکیاں بھرتا میں مہنک ہیں جن کے نقش قدم اس وقت تک نہیں مٹ سکتے جب تک کہ ہم بیٹے کوئی بھی زندہ ہے۔ یہ ایک عام بات ہے کہ ہم امریکی یا برطانوی یا کوئی اور شخص جو حملوں کی زد سے بچا ہوا ہو اور جس کی معلومات کے ذرائع، اخبار، فلم اور الفاظ ہوں جنگ کے بارے میں اتنا واضح نقطہ نگاہ نہیں رکھ سکتا جو بھرتا کے بعد ممکن ہے۔

لاکھوں روسی بچوں نے اپنے ماں باپ، بھائی بہنوں یا ہمسایوں کو مرتے، قتل ہوتے یا بھوک کا شکار ہو کر دم توڑتے دیکھا ہے یا قریب المرگ۔۔۔۔۔ ان کے مکان نظروں کے سامنے نذر آتش ہو گئے۔ ہمارے تاثرات اس وقت تک وہی نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہم پر ایسے کٹھن لمحے نہ گذریں۔ کسی کے چہیتے کا کہیں دور

مخاذ جنگ پر مر جانا یا سمندر میں غرق ہو جانا یقیناً ایک عظیم واقعہ تو ہو سکتا ہے لیکن انہیں کیا کہئے جو اپنے پاس ہی اپنی آنکھوں کے سامنے کسی کو نذر اجل ہوتے دیکھیں اور واقعہ کے فوراً بعد ہی گوروس میں رہتے ہوئے بھی روسیوں کے دلی تاثرات کا علم مشکل ہے۔ دردناک واقعات اور مناظر بھلائے نہیں جاسکتے میں رزہیف میں ایک روسی خاندان سے سرگرم گفتگو تھا جنکی کہانی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ رزہیف کی آبادی بھی پینسٹھ ہزار تھی۔ گو دور سے یہ اب بھی ایک شہر دکھائی دیتا ہے لیکن قریب پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ گویا کوئی بڑا اسٹیج ہے جس پر درودیوار کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ میں گزر رہا تھا کہ یاس ہی کچھ مکانات ملے جو حلوں کی زد سے بچ رہے تھے۔ کسی گئے گمانے کی آوازیں سنائی دین — ایک مسجور کن روسی موسیقی — میں رک گیا۔ دوسرے دروازے سے گانے کی آواز آرہی تھی۔ ہر ذہن میں اس خیال کا پیدا ہونا ضروری ہے کہ یہ سحر کار معنی کوئی سرخ فوجی تو ہو نہیں سکتا۔ وہ وکٹر ولاسکوف ایک سترہ سالہ لڑکا تھا۔

میں کئی میں چلا گیا اور دوپہر تمام علینا، وکٹر اور اسکی ماں سے گفتگو میں بیت گئی جس کا عجیب نام یزدوکا تھا اور اس کا دادا الگز نڈر ولاسکوف روس اور جاپان کی جنگ میں کام آیا تھا۔

ایک تیم لڑکی علینا مار کو فاس سے بھی میری ملاقات ہوئی۔  
 وہ ایک خستہ لباس پہنے تھی۔ اسکی سیاہ آنکھوں کے  
 نیچے گہرے سیاہ حلقے پڑے تھے اور اپنے نحیف و نزار جسم پر  
 ایک بڑا سر سنبھالے تھی۔ نیم فاقہ کشی اور پیہم صعوبتوں کے باعث  
 چہرے کے خدو خصال سے کوئی چالیس سالہ عورت معلوم ہوتی تھی  
 جو زندگی کے سرد و گرم سے بخوبی واقف ہو۔ تیرہ سال ہی کی عمر  
 میں علینا نے اپنے عزیز بڑا رشتہ دار 'شنا سائی' سب کچھ کھوئے۔  
 سو ایک وکٹر کے جو اسے گلیوں میں پھرتے ہوئے ملا اور اپنے  
 گھر لے آیا۔ علینا ان دو سوا فراد میں سے تھی جو اس وقت تک  
 رزہیف میں تھے جب کہ روسیوں نے اسے دوبارہ حاصل کر لیا۔  
 جرمنوں نے رزہیف پر اکتوبر ۱۹۱۴ء میں قبضہ کیا اور میرے یہاں  
 پہنچنے سے کچھ ہی دن پہلے بھاگے ہیں۔ جرمنوں کے آنے سے پہلے  
 علینا ایک مدرسہ میں زیر تعلیم تھی جو اب تباہ ہو چکا ہے۔ اس کا  
 باب ایک میکانک تھا اور ماں ایک فیکٹری میں کام کرتی تھی۔ وہ  
 علینا کی دادی سمیت ایک اچھے مکان میں رہتے اور خوشی کے  
 دن گزار رہے تھے۔ اور اب

اپنی سنجیدہ آنکھوں سے رنجیدہ انداز میں اس نے میری طرف  
 دیکھتے ہوئے کہا " ایک بھیب ہمارے مکان پر گرا وہ بری طرح پھٹا  
 لیکن مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا۔ جرمن رزہیف پر قبضہ کر چکے تھے

اور وہ ہمارے گھر میں بھی گھس آئے۔ انہوں نے ہمیں ایک کمرے میں رکھ چھوڑا اور ہم سے اپنا سارا کام لیتے رہے مکان کی صفائی کپڑے دھونا اور بوٹ صاف کرنا۔

”میرا خیال ہے وہ تمہیں معاوضہ میں کھانا کھلاتے ہونگے“  
 ”ہنیں وہ ہمیں کچھ نہ دیتے تھے البتہ ان کے بچے ہوئے کھانے سے ہم اپنی غذا کا بندوبست کر لیا کرتے“  
 ”تم سے ان کا برتاؤ کیسا رہا؟“

”انہیں روسی زبان نہ آنی تھی۔ وہ چلاتے اور ہم ان کا مطلب سمجھ کر ان کی ضرورتوں کا اندازہ لگا لیا کرتے تھے“  
 ”لیکن کیا کوئی جرمن کبھی تم پر مہربان نہ ہوا۔ خواہ ایک بار ہی سہی کسی نے تمہیں کوئی کھانے پینے کی چیز نہ دی؟“  
 قدرے سکوت کے بعد علینائے نفی میں اپنا سر ہلایا اور میری طرف دیکھنے لگی۔

”ایک بڑا افسر جو ہمارے ہاں ہوتا تھا کافی اچھی غذا میں استعمال کیا کرتا ایک بار میں جب اس کے بوٹ صاف کر کے لے گئی تو میں اس سے کوئی مٹھائی مانگی اس نے مجھے ایسا دھکا دیا کہ دوسرے لمحے میں دروازہ کے باہر تھی اور ایک مرتبہ کسی چیز کے مطالبہ پر اس نے میرے دھول جمادی“  
 علینائے دادی سخت علییل ہو گئی اور شہر میں اس وقت کوئی

ہسپتال کھلا نہ تھا۔ وہ کچھ روز بعد مر گئی اور جرمنوں نے حکم دیا کہ فوراً اسکے تجہیز و تکفین کا بندوبست کر دیا جائے۔ گو علینا کے والدین بھی پہلے سے بیمار تھے لیکن انہیں اس سرما کی رات میں میست کو لیجانا پڑا۔ علینا بھی ساتھ گئی اور واپسی پر اسکا باپ بحمد فریش علیل ہو گیا اور دوسری صبح اسکا بھی خاتمہ ہو گیا۔

جرمنوں نے انہیں نکال باہر کیا اور وہ قریب کے ایک دیہات میں اپنی خالہ کے پاس چلی گئی۔ کچھ ہی دنوں بعد اسکی خالہ اور اسکا بچہ بیمار ہو کر دو اخانے چلے گئے۔

”میں آٹھ دن دو اخانے میں رہی“ علینا نے اپنی شیریں مگر دکھ بھری آواز میں کہا۔

”بہس روزانہ صرف سو گرام روٹی کے علاوہ کچھ نہ ملتا تھا۔ روٹی اور پانی میری غذا تھی جیسے ہی میں چل پھر سکنے لایق ہوتی ماں نے مجھ سے چلے جانے کو کہا اس لئے میں شہر لوٹ آئی تاکہ اپنے ماموں کے ہاں رہ سکوں۔ اسکے سات بچے تھے اور وہ سب ایک ہی کمرے میں رہتے تھے کیونکہ تمام مکان پر جرمنوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ لیکن ماموں نے مجھ اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔“

”اور تمہاری ماں“

”ایک ہفتہ بعد ایک گلی سے گزرتے ہوئے میں ایک دیہاتی عورت سے ملی جس سے معلوم ہوا کہ میری ماں مر چکی“ ان تمام دردناک

واقعات کے بیان کرنے کے دوران میں اس وقت پہلی بار علینا کئی آنکھوں میں آنسو امانڈ آئے۔ میں نے اس کی کمر کے گرد اپنا ہاتھ پھیلا دیا اور اس تاریک کمرے کے اطراف جہاں ہم بیٹھے تھے ایک نظر ڈالی۔ تمام درمیچوں کے شیشے ڈوٹ چکے تھے۔ البتہ ایک دریچہ کے صحیح و سالم شیشے سے روسی سرما کے سورج کی مدھم شعا عین داخل ہو رہی تھیں۔ دریچہ کے پاس ایک کھلی کتاب تھی۔ گوگول کا ایک پرانا ایڈیشن جس پر چمڑے کی جلد تھی۔ اور کمرے کے ایک گوشے میں ایک "کنواری" اور ایک بچہ کا ستھرا مجسمہ رکھا تھا وہ ماں اور بوڑھا مذہبی تھے گوان کے دونوں بچوں نے دہریت قبول کر لی تھی۔ ایک کھنہ میز کے پاس کچھ خراب و خستہ کرسیاں کبھی تھیں۔ اس کمرے کے علاوہ مکان کے بقیہ تمام حصہ پر جرمن قابض ہو گئے تھے جو کبھی کبھی منتقل ہوتے رہتے تھے۔ لیکن اب وہ بالکل منتقل ہو چکے تھے جب کہ انہوں نے وہ مکالمہ سنا۔ یہ ایک دہرائی ہوئی کہانی تھی جو انہوں نے مختلف مقامات پر کئی علیناؤں سے سنی تھی۔

”تم اپنے ماموں کے پاس جرمنوں کے ساتھ کیسے رہیں گے انہوں نے تمہارے کھانے پینے کا کوئی بندہ و بست کیا“

”شہر لوٹ کر میں سڑک پر کام کرنے لگی۔ میں اینٹ پتھر ڈھونڈتی اور جرمن مجھے ہر ہفتہ آدھا ڈبہ آٹا اور پانی دیتے۔ میں اس کا

استعمال کرتی رہی جس سے ہمیشہ میرے پیٹ میں درد رہا۔  
 رزہیف کے قریب جب روسی مدافعت شروع ہوئی اور جرمن  
 تقریباً تمام شہروں سے نکال دیئے گئے تو مایوسی تمام روسیوں کو وہ  
 اپنے ساتھ لے گئے۔ علینا کے ماموں کو بھی جانا پڑا لیکن علینا کسی نہ  
 کسی طریقے سے اس وقت تک وہاں رہی جب کہ رزہیف واپس  
 لے لیا گیا۔ شہر چھوڑنے سے دو روز قبل انہوں نے سارے باقی ماندہ  
 روسیوں کو اس گربے میں جو تمام شہر میں ایک ہی پتہ رکھا تھا جمع کیا اور  
 جن باشندوں نے عذرخواہی یا بچنے کی کوشش کی مار ڈالا۔

علینا نے یوہنی واقعات بیان کئے اور میں نے اس پر یقین کر لیا۔  
 ایک گندی گلی میں کچھ مکانات نسبتاً محفوظ اور ابھی حالت میں تھے  
 جنہیں میں دیکھنے گیا اور ایک روسی افسر بھی میرے ہمراہ تھا۔ ایک  
 بموں اورشل سے محفوظ تھا البتہ فرینچر شکستہ تھا۔ تقویریں لڑی  
 ہو گئی تھیں اور کسی قسم کی غمناک نشانی نہ تھی۔ اس میں ایک خاندان آباد تھا جو  
 اس مکان کے مالک تھے۔ لیکن جرمنوں نے اپنے دوران قیام میں  
 ان سے مکان چھین کر انہیں ایک کمرے میں رکھ چھوڑا

سب سے پہلے ہم نے وہاں ایک ماں کی لائش دیکھی جو کمرہ کا تنگ  
 راستہ روکے پڑی تھی۔ اس کا سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا اور یوں  
 محسوس ہوتا تھا کہ کسی مضبوط انسان کے ہاتھوں کی گرفت نے اس کی  
 جان لی ہے۔ باپ نیم برہنگی کے عالم میں ایک کوچ پر جھکا ہوا تھا جس

پر ایک قبول صورت لڑکے کی لاش تھی وہ بیماریوں کے باعث بچہ  
 ضعیف ہو چکا تھا اور اس کا ہاتھ کسی شدید ضرب کی وجہ سے بیڑھا  
 ہو گیا تھا۔ سر اور سینہ پر ہم سات گولیوں کے نشانات بہ آسانی  
 دیکھ سکتے تھے۔ کچھ ایسے رگھم جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ  
 چہلہ قریب سے کیا گیا۔ اس کے پیچھے دو ننھے بچوں کی لاشیں  
 ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی تھیں۔ انہیں بھی اسی طریقے سے  
 قتل کیا گیا تھا اور دوسرے کمرے میں ایک اور مردہ عورت  
 پڑی تھی۔

گلی کی دوسری جانب اسی طرح کا ایک اور مکان تھا۔  
 ایک عورت کو اسکی خواہنگاہ میں نذیر اجل کیا گیا تھا۔ اور گلی میں  
 ایک خاندان کی لاشیں پائی گئیں جس کا نام سارڈف تھا۔  
 ماں اور باپ دونوں قتل کر دے گئے بیٹی مجروح تھی۔ لڑکے کی  
 داہنی آنکھ زخمی کر دی گئی اور کاٹیا ناجی ایک پانچ سالہ لڑکی  
 کے سر پر شدید ضرب آئی تھی۔

علینا نے ایک بوڑھی کی لاش دیکھ کر بتایا کہ یہ شدید بیمار  
 تھی اور اسی بنا پر التجا کی کہ اسے گھر چھوڑنے پر مجبور نہ کیا جائے۔  
 جس کا جواب اسے موت کی صورت میں ملا۔

کئی مشاہدات سے پتہ چلتا ہے کہ جرموں نے باقی ماندہ شہر بوم  
 کو ان کے مکافوں میں مقفل کر دیا اور پھر انہیں بوم اور دھماکو

اشیا سے نیست دنا بود کر دیا اس گر جا کو جس میں علینا اور ایک سو پچاس باشندوں کے ساتھ رکھی گئی تھی پھونک ڈالا گیا۔ لیکن کسی نہ کسی صورت وہ بیچ نکلی اور دو دن اور تین راتوں تک وہیں رہی جب کہ اطراف و اکناف نسل اور بمب پھٹ رہے تھے لیکن ایک صبح اس نے گلی میں ایک سرخ سپاہی کو دیکھا۔ سال بھر بعد آج اسے ایک سرخ فوج کی صورت نظر آئی تھی۔ وہ بالکل باہر نکل کر سپاہی سے لپٹ گئی اور پھر فوراً اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں سے جتنا تیز جاسکتی تھی اپنے گھر پہنچی۔ گو اس کے مکان پر جرمن قابض تھے لیکن یہ بات کسی مجرّمہ سے کم نہ تھی کہ یہ مکان ابھی تک محفوظ تھا جب کہ آس پاس کی ہر چیز تباہ اور برباد ہو چکی تھی۔

”یہ کیسے ممکن ہوا علینا؟“

”وہاں کچھ نہ تھا۔“ اس نے اپنی شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ گھبرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کچھ بھی نہیں۔ ایک سماوار تک نہیں۔ جرمنوں نے جانے سے پہلے سب کچھ جلا دیا۔“

یہ تھی علینا کی داستان یا اس کے غم انگیز تاثرات ———  
 جہاں تک وکٹر اور اسکے خاندان کا تعلق ہے۔ وہ اب جرمنوں کے قیدی ہوتے اگر اسکی ماں نے دانشمندی سے کام نہ لیا ہوتا۔ وہ ایک کرسی پر جھکی ہوئی علینا کی کہانی سن رہی تھی اور چہرے سگرے غم داندوہ کے آثار ہویداتھے۔ اسکی عمر چھتیس

برس کی ہوگی۔ ایک سن رسیدہ عورت جس نے علینا کی طرح جرمنوں کے  
 لا تعداد مظالم سے اس نے ایک معمولی چھینٹ کا سرخ سوئی لباس پہن  
 رکھا تھا۔ لیکن اسکے باوجود وکٹر کے بدن پر معمولی لمبوسات تھے۔ اس  
 نے بتایا کہ اس کا شوہر اور بھائی سرخ فوج میں ملازم تھے اور ایک سترہ  
 سالہ بھائی کو جرمنی لے جایا گیا۔ ایک سال سے زیادہ عرصہ گزرا کہ  
 اسے ان سے متعلق کچھ نہیں معلوم۔ وہ خود پوسٹ آفس میں کام کرتی  
 تھی اور اس نے اپنا کام ترک نہیں کیا یہاں تک کہ دوسرے شہریوں  
 کے ساتھ اسے بھی پھالش لیا گیا۔ جرمنوں نے اس سے سارا مکان  
 چھین کر ایک کمرہ حوالہ کر دیا وہ اسے کسی قسم کی غذا نہ دیتے تھے۔  
 وہ آلو بیجی رہی اور گاہے گاہے دیہات جا کر اپنا سامان بھی  
 فروخت کر ڈالا اور وہاں سے خور و نوش کا سامان لاتی رہی  
 لیکن ہر بار جب وہ رز ہیٹ واپس آتی جرمن اسکے شہر میں داخل  
 ہونے سے قبل ہی اس کا بیشتر سامان چھین لیتے۔

”ان لوگوں کا کیا حال تھا جن کے پاس اس قسم کی تجارت کی کوئی  
 سبیل نہ ہو“

”وہ فاقے کرتے یا محنت مزدوری کرنے جرمنی چلے جاتے اور بیشتر  
 افراد جرمنی جانے پر فاقہ کرنے کو ترجیح دیتے“ اس نے اپنا بیان جاری  
 رکھتے ہوئے کہا ”سرخ فوج کے دوبارہ داخل ہونے سے کچھ ہفتہ قبل  
 جرمنوں نے ہر اس فرد کو جو رز ہیٹ میں رہ گیا تھا۔ اسمولنگ کے

راستے نکال باہر کیا۔ بلا کی سردی تھی اور ہزاروں مردوزن بیمار یا فاقہ کش تھے کئی راستے ہی پر دم توڑ رہے تھے۔ میرا بچہ اور والد سخت علیل تھے۔ والد کو شدید بخار تھا اس لئے انہوں نے جرمنوں سے التجا کی کہ انہیں کچھ دن ٹہرنے دیا جائے وہ جانتے تھے کہ سرخ فوج آرہی ہے۔ لیکن جرمنوں نے جبراً ہمیں وہاں سے چلتا کیا۔ ہم هجوم کے پیچھے پیچھے چلتے رہے اور موقع پا کر اور کور و بیچ کے گاؤں میں رو پونشس ہڈ گئے۔ جب کبھی جرمن ہمارے قریب آتے تو ہم چلانے لگتے "تپا محرقہ" اور وہ ہم سے دور بھاگ نکلتے۔ ہم دس دن تک کسی نہ کسی بہانے بچتے رہے۔ بالآخر سرخ فوج پہنچ گئی جب ہم نے پہلے سرخ سپاہی کو دیکھا تو ہماری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور ہم نے اس کا ہر تپاک خیر مقدم کیا۔"

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ صوبہ کالینن کی ایک تہائی آبادی جہاں رزمین واقع ہے۔ یا پھر کم از کم، ۷ فیصدی باشندے جو وہاں رہ گئے تھے یا تو فاقوں سے مر گئے یا قتل ہوئے یا پھر انہیں محنت و مشقت کرنے اور مظالم سہنے جرمینی جانا پڑا۔ میرا ایک دوست جو تاریخ کا پروفیسر اور اس تحقیقاتی کمیٹی کا ایک رکن ہے جو اسمولنسک اور نین گراڈ کے علاقوں میں (جو دوبارہ حاصل کر لئے گئے ہیں) کام کر رہی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ آبادی کی اکثریت موت کی آغوش میں سوچکی ہے۔ اس نے کہا بعض

مقامات پر لطف سے زیادہ باشندوں کو نازیوں نے ختم کیا ہے۔ راستہ تمام لینن گراڈ سے قفقاز تک اور رزہیف سے ڈون تک میں نے روسیوں کی زبانی اتنے واقعات سنے اور یکیشم خود اتنے تباہ شدہ افراد اور خاندان دیکھے کہ مجھے اس کیسٹی کی رپورٹ معلوم کر کے ذرا بھی شبہ نہ ہوا۔ اس کیسٹی نے حالات اتنے سلیقے سے مرتب کئے ہیں اور اتنی تباہیوں کا ذکر کیا ہے کہ تاریخ شاید ہی اسکا جواب پیش کر سکے۔

مجھے موزہیا کس کی اس شریف النفس دہقان عورت کا خیال آیا جس نے مجھ سے بیان کیا کہ جرمن کس طرح اس کے مکان میں رہنے آئے پہلے اسکی گائے لے لی پھر اسکے دوسرے پالتو جانور۔۔۔۔۔ جنی این کہ اسکے پیروں کے جوتے تک چھین لئے۔ پانچ مہینے بعد سرخ فوج لوٹی اور اس کے ”ہمانوں“ کو اپنی راہ لینی پڑی جاتے سمئے انہوں نے مکان میں کچھ دستی بمب پھینکے اور اسے آگ لگادی۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ یہ ایک سرخ فوجی کا مکان ہے جو اس کا شوہر ہے۔ جب وہ اور اسکی بہن اپنے بچوں کو لیکر نکل بھاگے تو اسکی بہن کا بچہ مشین گن کا نشانہ بن کر ختم ہوا۔

دیر اگلا لکینوفا ایک جوان محلہ جو موزہیا کس سے قریب ایک گاؤں میں کام کرتی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ جرمنوں کو

یہ شبہ ہو کہ اس نے گوریلا سپاہیوں کو پناہ دی ہے۔ اور محض  
 اقرار کی خاطر انہوں نے گرم لوہے کی سلاخ سے اسکے گال داغ  
 دیئے۔ پھر اسے ایک تنگ دستار یک کمرہ میں بند کر دیا گیا جہاں  
 روشنی اور ہوا کے لئے کوئی راہ نہ تھی اور پھر اس میں کچھ اور  
 لوگ بھی آگئے۔

”ایک دن انہوں نے ہمارے لئے گھوڑے کا کچھ سٹرا ہوا  
 گوشت پھینک دیا۔“ اس نے کہا ”کئی دنوں بعد ہمیں یہی کچھ  
 ملا تھا اور بیٹھ کر کھانے کے لئے جگہ بھی نہ تھی آدمیوں کی کثرت  
 کی وجہ سے ہم کھڑے کھڑے ہی سوتے۔ میرے قریب ایک  
 آدمی مر گیا جو دوسروں کی مدد سے ابھی ابھی گھری بھر کھلے  
 کھڑا ہوا تھا۔“

ویرا کو بری طرح پیٹا جاتا تھا یہاں تک کہ اس نے  
 اپنے ہوش و حواس کھو دیئے۔ آخر اس کی بہن کو اجازت  
 دی گئی کہ اسے لیجائے چہ دن بعد جب اسے ہوش آیا تو  
 اسکی بہن نے بتایا کہ کپڑے تبدیل کرنے میں اسکی چمڑی  
 جگہ جگہ سے ادھر لگی ہے۔ ”جب سرخ فوج آئی تو میں  
 بدستور بیمار تھی یہ اور آخر میں اس نے کہا۔“ میں نے  
 ہفتوں سے سوا سٹری گلے آلوؤں کے اور کچھ نہیں کھایا،  
 یہ چند لفظوں کی مختصر سی کہانی آدمی کو گھنٹوں فکر مند

بنادیتی ہے۔ اور سننے والے کو بھی اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے جتنی کہ اس فرد کو جو ان مظالم کا شکار ہوا ہو۔ پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ مکان یا دفتر میں یہاں سے دور رہنے والا اس شدت سے محسوس نہیں کر سکتا۔ میں ویرا کا چہرہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ اور اسکی وہ آنکھیں جن میں ان مظالم کے ہفتوں بعد بھی وہی دہشت جھلکتی رہی۔ صرف ویرا ہی نہیں بلکہ راستوں سے گزرتے ہوئے کتنے ہی ایسے ستم رسیدہ ملتے ہیں۔

خارکوف کی آبادی ۹۰۰,۰۰۰ تھی لیکن اب ایک تہائی رہ گئی تھی اور ہر باقی ماندہ شخص ہمیں بیسیوں لرزہ خیز واقعات سناتا ہے جو اس نے خود اپنی آنکھوں دیکھے یا اس پر بیٹے ہوں۔ مشکل سے کوئی عورت یا بچہ ایسا ملے گا جس نے شہر یوں کو بچانسی پاتے نہ دیکھا ہو۔

استالین گرا دین میں نے صرف ایک مکان صحیح و سالم دیکھا۔ ممکن ہے کہیں بعض اور مکانات ہوں جہاں میں جانہ سکا۔ میرے ذہن میں اب بھی وہ مناظر ہیں جب کہ فیکٹریوں اور مکاناتوں کا ایک جال سا بچھا ہوا تھا لیکن اب میں صرف کھنڈر اور ویرانے پائے میری جائے قیام سے کچھ دور ایک پہاڑی پر ایک چھوٹی سی جھونپڑی رہ گئی تھی جہاں ایک ماں اور بچہ رہتے تھے جو تار و پت کی سب سے زیادہ ہولناک لڑائی

کے دوران میں بھی وہیں تھے۔ میں ان سے ملنے چلا گیا کیونکہ  
استان گراڈ کے اصلی باشندوں میں بس وہی رہ گئے تھے۔

یہاں ایک بڑا صنعتی شہر تھا جسکی آبادی نصف ملین تھی  
اور بالکل میرے وطن کناس شہر کی طرح — فوراً بعد ہی  
میری نظروں کے آگے وہ مناظر آ گئے جو ایک شہر کے لازماً  
ہیں۔ حسین عمارتیں، اسکول گرجا گھر۔ تھیٹر، دفاتر، کارخانے  
وغیرہ لیکن یہاں ویرانی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ زندگی کے کوئی  
آثار نہ تھے البتہ کھنڈرات اور غاروں میں کہیں کہیں کچھ بگڑے  
ہوئے انسانی ڈھانچے نظر آ رہے تھے۔

میں نے صرف انہی مقامات کا تذکرہ کیا ہے جسے دیکھنے کا  
مجھے موقع ملا اسکے علاوہ اور درجنوں علاقے ہیں جو سرخ فوج  
نے دوبارہ حاصل کئے ہیں جیسے رستوف، کرسنو ڈا، وارشلوف  
گراڈ، کرسک بھی بالکل اسی حالت میں پائے گئے۔ جیسے  
استان گراڈ، رزہیف اور فارکوف

لیٹن گراڈ کے تاریخی ویرانے میں جو یورپ کا ایک حسین  
شہر تھا وہاں کی ایک تہائی آبادی موت کی آغوش میں سو  
رہی ہے۔ کیف میں جرمنوں نے شدید غارتگری اور قتل  
و خون کیا ہے مالوٹوف کے تحقیقاتی بیان کے بموجب ” ۵۲۰۰۰  
مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے قتل کئے گئے۔ یہ ایک سال

پہلے کے اعداد میں۔ لیکن آج ۶  
 نئے یوکرین میں ایک نازی مطبوعہ رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ کیف  
 اب ایک بڑا دیہات معلوم ہوتا ہے۔ سارے باشندے دیہات  
 دکھائی دیتے ہیں۔ اب وہاں تین ہزار محنت کش چھوڑ دیئے  
 گئے ہیں۔“

کیف جو کبھی روس کا تیسرا بڑا شہر تھا اور جہاں تقریباً  
 ۲۰۰۰۰۰۰ مزدور کام کرتے تھے اب ایک دیہات سے زیادہ  
 حیثیت نہیں رکھتا تو ان دوسرے شہروں کی آدیلہ، منسک،  
 نکولاف، اسمولنسک کا کیا حال ہوگا۔

نازی ازم کو کوئی اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک  
 کہ یہ نہ جانتا ہو کہ ہٹلر اپنی پالیسی کو بہ ہزار خرابی و بد عمل لانا  
 چاہتا ہے۔ اور جبر و تشدد سے اس نے ان انسانیت سوز  
 افعال و کردار کو اپنے عوام سے منوالیا ہے۔ اپنی فتح کے  
 زعم میں اس نے لاکھوں انسانوں کی جائیں گنوائیں انہیں فاقوں  
 کا شکار کیا اور تہذیب کے اس ارتقائی دور میں اپنی بربریت  
 کا ثبوت دے رہا ہے۔ ہٹلر چاہتا ہے کہ روس کا پھر حسین  
 شہر ایک دیہات بن جائے لیکن وہ سارے سرخ فوجیوں  
 کا خاتمہ نہیں کر سکتا جو ایک ایک انج زمین کے لئے اپنے  
 خون کا آخری قطرہ بہا دینے آمادہ ہوں۔

دوسروں کے جذبات کو اسی رنگ میں سمجھنا دشوار ہے اور ہم روس کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ ہم اپنی زندگی سے اسے مطابق نہ کریں۔ میں صرف آپ کو وہاں کے حالات سے کسی حد تک آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ نہیں کہ جنگ کا رخ کیا ہے۔ کون کون علاقے کس کس کے قبضہ میں ہیں بلکہ ان لاکھوں باشندوں کی المٹناک زندگیوں کے بارے میں جو موت سے کھیلتے ہیں اور ان کے آس پاس ہر چیز جنگ کی ہولناکیوں کے باعث تباہ و برباد ہو رہی ہے اور موت کے دہلک اثرات ان کے ہوش و حواس پر اپنے سانس پھیلانے ہوئے ہیں۔

لیکن یہ سمجھ لینا غلط ہے کہ وہ بہر طور زندگی گزارنے کے لئے جینا چاہتے ہیں یا موت سے خائف ہیں۔ میں جب لیننک میں تھا تو استالین گراڈ سے کچھ ہرمنی قیدی لائے گئے۔ ان کے سروں پر زنائی لوٹیاں تھیں اور جسموں پر بہ تعداد کثیر زنائی ملبوسات۔ یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ روسی تماشہ میں متحیر ہونگے کہ ان عورتوں کا کیا حشر ہوا جو ان ملبوسات کے چھین لئے جانے پر سردی کا مقابلہ کرتے رہے لیکن انہیں کوئی تعجب نہ تھا۔

وہ پارٹی زان لڑکی جس کا میں نے ابتدا میں ذکر کیا

ہے اسنے مجھے بتایا کہ اسمولٹسک کے آس پاس اسکے ساتھیوں سے کیسے شرمناک برتاؤ کئے گئے ساتھ ہی مجھے یہ معلوم کر کے انتہائی حیرت ہوئی کہ اکثر جرمن اپنے اسلحہ سمیت پارٹی زان دستوں میں شامل ہو گئے۔ اور انہیں اجازت مل گئی۔ لینن نے کہا کہ ”ہم صرف ہٹلر یوں سے بندہ آزما ہیں ہمیں جرمن عوام سے کوئی بیز نہیں۔ ہم ہر مخالف فسطائی فرد کا سواگت کرتے ہیں خواہ وہ جرمن ہو یا کوئی اور۔ ہم میں سب سے اچھا مشین گن چلانے والا ایک جرمن ہے۔ ہمیں اس پر اعتماد ہے اور اسے پسند کرتے ہیں“

میں پانیا، لینن اور کنتا کو پسند کرتا ہوں اور ان سارے عوام کو جو حقائق کی تہ تک پہنچتے ہیں جو اتنے منطالم سہنے پر بھی جرمن سے ناخوش نہیں جو اچھائی کو پرکھتے ہیں اور بھلائی کے متلاشی —

## گوریلا لڑکی - اپنا

جنگ کے ابتدائی ایام تھے۔ ننگ کیونسٹ لیگ کی ضلع کیٹی کے تنگ کمرے میں نوجوان صبح تک شور مچاتے رہے۔ کمرے کے ایک طرف بنخ پر انکا سامان جنگ نہ کھا تھا یہ نوجوان محاذ پر جا رہے تھے۔ ان یکینے جرمین فاشیوں کا خاتمہ کرنے جو چوروں کی طرح انکے ملک میں گھس آئے تھے۔ نفرت اور فخر سے انکی آنکھیں دمک رہی تھیں۔

ہر سو ویٹ نوجوان اور ہر نوجوان لڑکی کا دل نفرت سے مملو تھا۔ نفرت اپنے ملک کے دشمن، ساری انسانیت کے دشمن سے۔ آخر کار وہ وقت آ پہنچا جبکہ انہیں اپنے ملک کی آزادی اور مسرت کی تلاش میں ایک فیصلہ کن جنگ کے لئے جانا پڑا۔ اور اب تک انہیں ایسی مقدس لڑائیوں کے بارے میں صرف کتابوں سے کچھ حالات معلوم تھے یا ان کے اجداد کی جنگ آزادی کی روایتوں سے۔

اسوقت وہ ضلع کینیڈا کی سکریٹری اینا شبنوک کو گھیرے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کے ہاتھ کو اتنا دبایا کہ وہ درد ہونے لگا۔ وہ اس سے رخصت ہو رہے تھے اور اینا شبنوک پر جوش انداز سے ہاتھ مار رہی تھی۔

”ہم پھر ملیں گے۔ میں تم سے بالکل رخصت نہیں ہو رہی ہوں۔ کامریڈس ہم اس درندہ صفت ہٹلر کی کھال کھینچ دینگے اور پھر ایک بار ہم ملکر کام کریں گے۔ ان درندوں کو سخت سزا دو۔ انہیں فنا کر دو۔“

اس کا چہرہ جوش سے تمٹمار ہا تھا۔ وہ کس قدر مسرت محسوس کرتی اگر یونیفارم پہن کر فاشیستوں کے استیصال کے لئے محاذ چلی جاتی مگر

جب نوجوان کیمونسٹ لڑکوں کے قدموں کی آواز گم ہو گئی۔ اور ان کے فوجی گیتوں کی تائیں لطیف ہواؤں میں کھو گئیں تو اینا شبنوک اپنی ساری طاقت سے اپنا جسم گھسیٹتے ہوئے ان لڑکیوں کے قریب پہنچی جن کے ابروؤں پر ابھی تک شکنیں تھیں اور ان نوجوانوں کے قریب جو رہ گئے تھے۔

”تم سب خاموش کیوں ہو۔ ہمیں اپنا کام شروع کر دینا چاہئے کامریڈس۔“ اور اینا شبنوک ان لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ اپلوں، سرڈکوں، کنوؤں اور کھیتوں کی محافظت

میں مشغول ہو گئی۔ رات کے کسی گھنٹے بھی اس ینگ کمیونسٹ لیگ کے مختصر کمرے میں ٹیلیفون موصول ہوتے۔ ضلع کمیٹی سے ضلع سویٹ سے اور دفتر ملیشیا سے۔

”شبہینوک - کیا تم ہو“

”ہاں - میں ہوں“

”کیا تم ایک گھنٹہ بعد مجھے پچاس کمیونسٹ لڑکے بھیج سکتی ہو“

”ہاں بھیج سکتی ہوں۔ مگر کس قسم کا کام ہے“

”قندقیں کھودنی ہیں۔ تو تم کب بھیجو گی“

”ایک گھنٹہ بعد“

محاذ ضلع سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ پہلے زخمی سپاہی شہر لائے گئے۔ لڑکیاں دو اخانوں میں کام کرنے گئیں اور خود اینٹے بھی وہاں کام کیا۔ وہ اپنے آرام کی ہر ساعت زخمی سپاہیوں کے لئے دینے لگی۔

فاسٹسٹی لیٹرے قریب پہنچ گئے۔ ہر سمسکے میں ہم پھٹنے لگے۔ اور آس پاس کے گاؤں سے لوگ پناہ لینے آ رہے تھے۔ تھکے ماندے، زخمی خون میں لٹھڑے ہوئے۔ وہ ہٹلری کتوں کے بیھمانہ مظالم کے واقعات سناتے تھے۔ جنہوں نے بڈھوں کو زندہ چلا دیا، ماؤں کی موجودگی میں لڑکیوں کی عصمت پر حملہ کیا، حاملہ عورتوں کے پیٹ میں حجر گھونپ دیئے، اور مدرسہ

جاتے ہوئے لڑکوں کو کٹوؤں میں پھینک دیا۔

اینا شبیو نوک کا چہرہ تہمتا اٹھا۔ اور حسب معمول لڑکوں سے گھیرے ہوئے تھے۔ ”اینا، اب کیا ہوگا؟ جرمن بڑھتے جا رہے ہیں، وہ قریب پہنچ گئے۔“

”ہاں، وہ سو قریب پہنچ گئے، لیکن ہمیں ہر چیز کے لئے تیار رہنا چاہیے، جنگ بہر طور جنگ ہے، کامریڈس“

اینا کمرے میں ادھر ادھر ہلکتی رہی۔ پھر اس نے کامریڈس کی طرف رخ کیا، اس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔

”خود اپنے ملک میں جرمنوں کے محکوم رہنے سے مرنا بہتر ہے۔ ہم ان فاشست کٹوں سے انکی ہر قابل ملامت حرکت کا انتقام لیں گے۔“

”اس کے یہ معنی ہیں کہ ہمیں گوریلا میں شریک ہو جانا چاہئے۔“  
ایک کم عمر لڑکی نے انتہائی مسرت میں دھیمی آواز سے کہہ دیا۔  
”ہاں ہمیں شریک ہونا چاہئے۔“

اینا شبیو نوک اور دوسرے بنگ کیونسٹ لیگی روانہ ہو گئے اور وہ ہر گھر پر جاتے تھے، اینا کی ہرجوش آواز گونج رہی تھی جبکہ وہ وہاں کے باشندوں کو گھر بار، کھیت اور باغ چھوڑنے کو کہہ رہی تھی تاکہ جنگلوں میں جا کر گوریلا میں شریک ہوں اور فاشستوں کو ہر کہیں تنگ کر سکیں۔

”لڑکیو! عورتوں!!“ اینا نے جو شیلے انداز میں انہیں مخاطب کیا، ان فاشست کنٹوں کو ملک سے نکال باہر کرو۔ اور محض اس لئے کہ ان کھیتوں کو خود ہم نے سینچا ہے۔ اپنے بچوں کی نگہداشت خود ہم نے کی ہے۔ بہتیں معلوم ہے کہ انہوں نے آس پاس کے دیہاتوں میں کیا کیا ہے۔ اور اینا نے فاشستوں کے بہیمانہ کارنامے سناے، بوڑھی عورتیں، عورتیں، لڑکیاں، لڑکے ہمہ تن گوش تھے۔

”ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ بہن!“ انہوں نے پوچھا ”انتقام“ اینا چلائی۔ ”انتقام اپنے ملک کے دشمنوں سے“ جنہوں نے معصوم بچوں کا خون بہایا، لڑکیوں کی عزت ریزی کی، ہر قدم پر انہیں پریشان کر دو۔ تاکہ ان ہنگوں کو معلوم ہو جائے کہ ہماری لڑکیاں اور عورتیں وطن کی خاطر زندگی کا خاتمہ بھی کر سکتی ہیں۔ لیکن جرمن کتوں کی اطاعت نہیں کر سکتیں۔ ہم ان پر آفتوں کے پہاڑ توڑ دیں گے۔ چلو ہم جنگلوں کا رخ کریں اور گو ریلوں میں شریک ہو جائیں۔ ”لیکن ہمارے گھروں، اور اناج کا کیا ہوگا۔ اسے لڑکی“ بھر بہ کار عورتیں دریا نت کرنے لگیں۔ ”مکان، اناج، منی کا تیل، چلا دو، ہر چیز جلا دو“ اینا نے کہا ”اور ان سڑوں کے اسی دھویں میں دم گھٹا کر مرنے دو“ ہم جرمن درندوں کو اپنی کوئی اچھی شے نہ لینے

دیں گے۔ انہیں بھوکوں مرنے دو۔ وہ ہماری غذا میں کھانا چاہتے ہیں۔ تاکہ تازہ دم ہو کر دوس کے دوسرے دیہاتوں پر حملہ آور ہو سکیں۔ لیکن یہ نہ ہو سکے گا۔" اینا کے پر جوش الفاظ نے عورتوں کے دلوں پر گہرا اثر ڈالا۔ "یہ نہ ہو سکے گا" عورتوں نے فیصلہ کر لیا۔ "ہم اپنے اناج کے بھنڈا ر جلا دیں گے مگر کتوں کو حاصل نہ ہونے دیں گے"

"وہ وقت بھی آئے گا۔ کامریڈس عورتوں جب ہم بھرا اناج حاصل کریں گے۔ نئے گھر بنائیں گے۔ لیکن اب ہمیں ذیل کتوں کو ہراساں کرنا ہے۔ تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ ملک پر راج نہ کر سکیں گے"

عورتوں نے اینا کو گھیر لیا۔ اور اس سے باتیں کرنے لگے۔ "کیمینے جرمنا ہمارے آقا نہ بن سکیں گے ہم انہیں قتل کر دینگے انکے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے۔ پیاری لڑکی ہماری رہبری کر، ہمیں بتا کہ کہاں جانا اور کیا کرنا ہے"

ضلع کے اکثر باشندوں نے اپنے گھر چھوڑ دئے۔ اناج جلا دیا اور جنگلوں کی راہ لی۔ روسی لڑکیوں اور نوجوانوں نے شینوک کے ساتھ دیا اور وہ ان سب کو گوریلا میں شریک کرنے لے چلی۔ "شکر یہ۔ شینوک" گوریلا کمانڈر نے کہا۔ یہ قبل از وقت ہے" بے خوف لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور اسی وقت وہ اپنی

رائفل کی جانچ کر رہی تھی۔

اس نے پہلے ایک چھوٹے سے گاؤں کو آگ لگادی جس میں بہت سے فاشسٹی فنا فی النار ہو گئے۔

جنگل میں ینگ کمیونسٹ لیگ کے لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔ وہ آگ کے گرد بیٹھ گئے۔ اور اپنے لئے ایک سکریٹری کا انتخاب کیا۔

”اینا شبینوک کا انتخاب کرو“ ہر طرف سے صدائیں بلند ہوئیں ”بہت خوب“ لڑکی نے کہا۔ اور اسی جنگل میں تاروں بھرے آسمان کے نیچے اس نے قسم کھائی کہ وہ اپنے وطن روس کے لئے اپنا جان خون چھڑک دے گی۔

وہ حوصلہ مند لڑکی جو ایک توی دل و دماغ کی مالک تھی۔ اس نے دشمنوں کے جائے قیام میں پہونچکر ان کے اہم سامان جنگ کو بھونک ڈالنے کا ارادہ کیا۔ جب وہ یوٹی تو تھکن سے چور تھی اور اسکے جسم پر کانٹی دار جھاڑیوں کی وجہ سے خراشیں پیدا ہو گئیں تھیں، لیکن وہ بیحد سرد اور باشاش تھی۔

”میں نے اپنا کام پورا کر دیا“ اس نے کہا نڈر کو اطلاع دی۔ ینگ کمیونسٹ لیگ کی پیاری گوریلا لڑکی، اینا شبینوک کا نام کئی دیہاتوں اور شہروں میں پھیل گیا۔ جس نے دلہوں کو عبور کیا اور سرخ فوج کو اہم خبریں پہونچائیں۔ یہ ہماری اینا شبینوک

ہے جو گوریلا فوجی احکام کی پابجائی میں گھوڑے دوڑائے پھرتا ہے۔ نڈر اینا جو راستوں پر جرمنوں کو تہ تیغ کرتی ہے۔ اور جو مادر روس کی اس لڑائی میں لڑکیوں اور لڑکوں کی رہنمائی کرتی ہے۔ غیور اینا شبینوک جو ینگ سیمونٹ لیگ کی گوریلا جماعت کی سکریٹری ہے۔

سویت لڑکی اینا شبینوک پر گیت لکھے جائیں گے اور حکومت نوجوان جانناز عورتوں کی تمغوں سے حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

اینائے کے ساتھ کئی اور لڑکیاں بھی اپنے جینتے دیس کی مدد کو نکل پڑیں۔ فلکو شا گلیونکو، ناڈیا جھکو خکایا، کاسیا سما کو، فکایا، اپنے بھائیوں کے دوش بدوش گوریلا فوج میں شریک ہو کر برسہا پیکار ہیں۔ انہیں ہتھیاروں کا استعمال آتا ہے اور مردوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے یل اڑا دینے اور جرمن کو اڑ بڑ جلا دیئے وہ جنگلوں میں رہتے ہیں خمیوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں، ان کے لئے کھانا تیار کرتے ہیں، اور ان کے زخم دھوتے ہیں۔

ایک شام نوجوان گوریلا ریڈیوسٹ کے آس پاس بیٹھے تھے۔ اور لفظ بہ لفظ غور سے سن رہے تھے جو کہ... ماسکو سے نشر کیا جا رہا تھا۔ دفعتاً اینا شبینوک کا چہرہ دکھنے لگا۔

ناشکر کی صاف آواز سنائی دے رہی تھی۔

”دکٹر ٹالائیکن کا پیام سنے جو سوڈیٹ یونین کا، میرا اور طیارچی ہے اور یہ پیام گوریلا لڑکی اینا شینوک کے نام ہے“

”اینا۔ یہ تم سے مخاطب ہے اینا“ تمام کامریڈس نے کہا۔

لیکن اینا پہلے ہی ریڈ یوسٹ کے قریب کھسک چکی تھی۔ وہ خاموش تھی، اور سب خاموش ہو گئے۔ ایسا سکوت تھا کہ درختوں کی سرسراہٹ بھی آسانی سے سنی جاسکتی تھی۔

”کامریڈ اینا شینوک، کیا تم مجھے سن رہی ہو، تم سے دکٹر ٹالائیکن مخاطب ہے۔“ ہاں میں سن رہی ہوں“ اینا کی زبان سے بے ساختہ الفاظ نکل گئے۔ اسکا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ ”تم نے مجھے کبھی نہیں دیکھا، اور نہ میں نے ہی کبھی تمہیں دیکھا ہے۔ لیکن میں ایک نوجوان طیارچی ہوں اور تم ایک جوان گوریلا لڑکی مسلح کامریڈس، بس یہی رشتہ کافی ہے۔ میں تمہیں سلام کرتا ہوں، تمہارا شکر یہ ادا کرتا ہوں، اپنے تمام دوستوں، طیارچیوں کی طرف سے“

اینا شینوک بید مسرور تھی، اسکے چہرے پر مسرت کی لہریں دوڑ گئیں۔ وہ لوگ اس کا شکر یہ ادا کر رہے تھے۔ خود اسکی سرخ فوج اس کا شکر یہ ادا کر رہی تھی۔

ہم تمہارا شکر یہ ادا کرتے ہیں، اور تمام گوریلا سپاہیوں کا

جو سرخ فوج کو جرمنوں کے استیصال میں مدد دے رہے ہیں ہم سب کمانڈر اور سرخ سپاہی، تمہاری جانبازی کا اتباع کر رہے ہیں۔ پیارے گوریلا لڑکیو اور لڑکو - ہر وقت ہمیں اطلاع ملتی ہے کہ گوریلا دستے نے فاشستی ہوائی اڈے جلا ڈالے، جرمنوں کے کوارٹر ڈوں کو آگ لگا دی، ہٹلری بابو کو گڑھوں میں گرانے کا انتظام کیا، ہم یہ سب سن سن کر بیچر خوش ہوتے ہیں۔ ہم تم پر فخر کرتے ہیں اور ہم ان خونخواروں کو اور زیادہ شدید نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔“

”اینا شبینوک میں نے سنا ہے کہ تم نے کئی فاشستیوں کا کام تمام کیا ہے۔ میں تم پر فخر کرتا ہوں، جوان مرد اور عورتیں تمہارے نقش قدم پر چل رہے ہیں یاد رہے کہ تم جہاں بھی جاؤ گی، پاپیادہ یا گھوڑے پر، جنگلوں میں یا لدوں میں اور فوجی احکام کے تحت، فوجی مقاصد کے لئے گوریلا دستہ تمہارے ساتھ ہو گا میں بھی مع اپنے طیارے کے تمہارے ساتھ ہوں۔ اکیلا اور وہی ستارہ ہم پر چمک رہا ہے اینا، ہمارے سروں پر ایک اور وہی سوویٹ آسمان ہے، کیا تم سن رہی ہو اینا؟“

”ہاں میں تمہیں سن رہی ہوں“ اینا ڈور سے چلائی۔ لیکن یکا یک ایک سیٹی سی سنائی دی، اور وہ لڑکی اب اس ہوا باز کے الفاظ سمجھ نہ سکی۔ یہ کیسا کیا ہوا۔ یہ کیا توہین ہے، ہر لفظ

کتنا پیارا تھا۔

اور ایک بہ یک پھر اس نوجوان لیبارچی کے الفاظ سنائی  
دینے لگے۔

”اینا شبینوک۔ مجھے یقین ہے کہ ایک روز ہم ماسکو میں ملیں گے۔  
ہمارا پیارا صدر مقام، جب کہ ینگ کمیونسٹ لیگ کی کانفرنس  
ہوگی اور ہم بڑی گرجوشی سے مصافحہ کریں گے۔ لیکن اگر ہمیں اپنے  
محبوب وطن کی خاطر قربان ہو جانا پڑے ساری انسانیت کی  
بہبود کیلئے، تو ہمارے کامریڈ، سوڈیٹ کے نوجوان، لڑکے  
لڑکیاں ہمیں اچھے الفاظ سے یاد کریں گے۔ وہ کہیں گے ”وکٹر  
ٹالالیکھن کی پروانہ بیکار ثابت نہ ہوئی۔ اینا شبینوک کی جدو  
جدو بے سود نہ تھی۔“ بڑھے چلو کامریڈس، گوریلا، اٹھو اور  
دشمنوں پر چھا جاؤ“

اینا شبینوک اچھل پڑی۔ اسکی آنکھیں خوشی سے چمک  
رہی تھیں۔

”کامریڈ لڑکیو، ینگ کمیونسٹ لیگ کے جواؤ! اس دنیا میں  
جینے کی مجھے تمنا ہے لیکن یہ فاشت خوشخوار درندے، کوئی  
رحم نہیں کرتے۔“

”شبینوک“ ہمیں کمانڈر کے ہاں جانا چاہئے، ”غنیم کی  
فوج کا جائزہ لیجئے“ کسی کی آواز سنائی دی۔ اور اینا شبینوک جا چکی تھی۔

# ”تباہ کن فوج کی ایک لڑکی“

ایک مطمئن گول چہرہ، نفیس بال، نیلی مسکراتی ہوئی آنکھیں، بچکانی لب، اسے دیکھنے کے بعد تعجب ہوتا ہے کہ یہ کس قسم کی جنگجو ہے۔ اور ابھی کچھ ہی دن ہوئے کہ وہ کھیل کود میں مصروف تھی۔

ٹھیک یہی کمانڈر نے بھی سوچا جبکہ رایا ایونچنگکو نے اسے اپنی درخواست پیش کی جس میں اس نے واضح طور پر لکھ دیا تھا کہ وہ ریسا اسٹیٹیا لڑنا ایونچنگکو عمر بیس سال، فوراً سرخ فوج میں بحیثیت رضا کار شریک کر لی جائے۔

یہ جنگ کے پہلے دن کی بات ہے۔  
کمانڈر مسکرایا۔ رایا کی بھویں سکڑ گئیں۔

”نہیں اے پیاری لڑکی۔ میں مجبور ہوں“

لیکن رایا ایونچنگکو سے پیچھا چھڑانا آسان کام نہ تھا۔  
فیکٹری (کارخانے) کے تمام جوال سال مزدور اس اوزار بنانے والی لڑکی کی ثابت قدمی سے واقف تھے۔ اگر کوئی بات اسکے ذہن میں آجائے تو وہ اسکے لئے ضرور کوشاں رہتی۔ اور بغیر اپنا

ارادہ بدلے تک وہ دوکٹے جاتی۔ وہ ایک چھوٹے سے دیہات میں رہتی تھی۔ ایک روز اسے ایک شہر کے فیکٹری ورک شاپ اسکول میں تربیت حاصل کرنے کے لئے جانے کا ارادہ کیا۔ تب اسے خیال آیا کہ کسی بھی جتن سے اسے ماسکو جانا چاہئے۔ اور وہ ماسکو پہنچ کر ایک کارخانے میں اوزار بنانے کے کام پر مامور ہو گئی۔ اس نے سوشلزم کتابیں پڑھیں اور اب ایک اعلیٰ ادارہ میں تربیت حاصل کر رہی تھی۔

رایا کمانڈر کو سمجھا رہی تھی کہ اسے شریک کر لیا جانا چاہئے۔ عضہ کی حالت میں اور غضب آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ رائفیل سے مانوس ہے۔ فٹ بال کھیل چکی ہے۔ پانسو (۵۰۰) گز کی دوڑ میں حصہ لیا ہے اور ایک مضبوط دست و بازو کی لڑکی ہے۔ کمانڈر بے بس ہو گیا اور رایا ”تباہ کن فوج“ میں شریک کر لی گئی پھر بہت جلد کمانڈر کو نادم ہونا پڑا جب کہ رایا کے داخلے کے فوراً بعد ینگ کمیونسٹ لیگ کے نوجوان ارکان اسکے کمرہ میں داخل ہوئے اور معلوم ہوا کہ رایا اوزار بنانے والوں کی اس جماعت کی سکریٹری ہے۔ اور بسٹھوں نے درخواست کی کہ انہیں بھی شریک کر لیا جا کر محاذ پر بھیجا یا جائے۔

رایا نہایت شادمان تھی اور فوجی لباس زیب تن کر رہی تھی وہ پابریہ سنوئی انداز میں چل رہی تھی کیونکہ اسے فوجی بوٹ

ہنیں دیئے گئے تھے۔ اور اسی طرح وہ بحیثیت ایک فوجی کے  
 ماسکو کی گلیوں سے گذر رہی تھی۔ دوسرے فوجی اسے ”بابر ہنہ جنگجو“  
 کہہ رہے تھے لیکن وہ خاموش ہی تھی۔ اسنے سو بچا کہ ”آدمی ہمت  
 سے کام لے تو بربہنہ پیر اسکے لئے کوئی رکاوٹ نہیں“  
 ہاں ! بربہنہ پیروں نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اس رات  
 جب کہ فاشٹیسوں نے ماسکو پر ہوائی حملہ کر دیا۔

رایا ایو پنچنکو نے ابھی تین سو گرام صحت مند خون زخمی فوجیوں  
 کیلئے دیا تھا۔ اس کے یازو پر ابھی تک گاج کی پی پی لپٹی ہوئی تھی اور  
 اسے ہلکا ہلکا درد محسوس ہو رہا تھا۔ کہ فوراً تیار ہو جانا پڑا اور  
 اسنے اپنی رائفل سنبھالی۔

آتشزدگی ہو رہی تھی۔ کمانڈر نے انہیں حکم دیا کہ وہ کار آرد  
 اشیاء بچا لائیں۔ یہ ایک خطرناک کام تھا جس میں جان کے لالے  
 تھے۔ شعلے بھڑک رہے تھے لیکن کسی بھی فوجی نے اپنی زندگی کے  
 متعلق نہ سو بچا۔

”ہم یہاں ہیں کامریڈ کمانڈر“ انہوں نے جواب دیا رایا اچھل  
 پڑی اور اسنے بھلا دیا کہ ابھی وہ تین سو گرام خون دے چکی ہے۔  
 ”کامریڈ کمانڈر میں انبجا کرتی ہوں کہ مجھے اجازت دیجئے“  
 اسکی آواز میں اتنا عزم اور استقلال تھا کہ کمانڈر اسے روک نہ سکا۔  
 وہ بہادر کمن لڑکی دھکتی ہوئی آگ میں کود پڑی۔ اور اپنے

غصے مضبوط ہاتھوں سے اسنے حکومت کا سامان بجایا۔  
 سارے فوجی حیران تھے کہ یہ کم عمر برہنہ پارلر کی کس قدر  
 جانکاہی۔ اور عجلت سے کام کر رہی ہے۔ لیکن رایا خیال کر رہی  
 تھی کہ وہ سستی سے کام کر رہی ہے۔ اور اسے تیزی سے تمام  
 اشیاء بجالانی چاہئیں۔ وہ شغلوں سے ایک شے بجالانی  
 اور پھر دوسری کے لئے لپک جاتی اور پھر تیسری۔ اور اس طرح۔  
 اسکا چہرہ اسکے بال دھویں سے سیاہ پڑ گئے تھے۔  
 کچھ دن بعد جب رایا دوسرے فوجیوں کے ساتھ کھاتا  
 کھانے میں مشغول تھی تو ایک خبر رساں طعام خانے میں خل ہوا۔  
 ”ایو پنچنگو۔ چلو مہتیں میجھ نے بلایا ہے“  
 لڑکی گھبرا گئی۔ کیا اس سے کوئی غلطی سرزد ہوئی؟ لیکن  
 اسے معلوم نہ تھا کہ حکومت نے اسکی بہادری کے صلہ میں انعام  
 دیا ہے۔

وہ بو کھلائی ہوئی اپنے افسر کے ہاں پہنچی۔  
 ”رایا ہم مہتیں ہو امیں اچھال دینا چاہتے ہیں“ اس نے  
 بزرگانہ شفقت سے کہا۔

شب و روز ہمارے سپاہی ماسکو کی محافظت کرتے ہیں  
 رات دن شجاع لڑکی رایا ایو پنچنگو ہماری حفاظت پر مامور رہتی  
 ہے۔ وہ رات کے لباس میں اپنی موٹس اور سچی ریشم بندوق

تھامے ہوئے ہے۔ رایا ایڈیو پنچنگکو کا نشانہ بہت صحیح ہے۔ اور جب وہ اپنی رائے سنھا لکر نشانہ لے تو دشمن کے سیاہ دل پر گولی کا جا لگنا ضروری ہے۔

آج رایا غیر معمولی کام سے قبرستان پر متعین تھی اسکی متحسس آنکھیں آسمان پر لگی ہوئی تھی اور اس کے کان آہٹ پر چاند کی کرنیں پھیلی ہوئی تھیں اور سرد ہوا تھپیڑے مار رہی تھی۔  
راستوں پر سائے متحرک تھے، وہ اپنے کام میں مہمک تھی لڑائی کے تمام اصول و آئین سے واقف، نکل ہی ایک مصنوعی حملہ کے بعد کمانڈر نے اسکی تعریف کی تھی۔ رایا ایک ذہین اسکاؤٹ تھی۔

جب اسے حکم دیا گیا تو بیرونی اخباری نمائندوں سے ملاقات کرنی پڑی۔ ہر شخص اس بہادر لڑکی سے ملنے کا متمنی تھا جس نے ابھی اپنی زندگی کی صرف بیس اکہاڑیں دکھیں ہیں۔  
”اسوقت جب کہ تم اپنے محافضتی کام پر متعین ہو اگر ایک بم گر جائے تو کیا کرو گی“

”میں اپنا کام جاری رکھوں گی“ لڑکی نے اطمینان سے کہا۔  
”میں آواز سے اندازہ کروں گی کہ بم کہاں گرا ہے، اگر کہیں قریب ہو تو میں میدان میں لیٹ جاؤں گی۔“

”لیکن اگر تمہاری آنکھوں کے سامنے کوئی چھتری والا جرمن

سپاہی اتر پڑے تو تم کیا کرو گی ” دوسرے اخبار نویس نے دریاقت کیا۔ رایا کی بھویں تن گئی۔ اسکی اس مختصر سی فوجی زندگی میں ایسا وقت کبھی نہ آیا تھا۔

” میں اس کا سر قلم کر دوں گی ” وہ غضب آلود لہجہ میں چیلانی اور اس کی نیلی مسر اور آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں۔  
رایا کسی جرمن افسر کو اپنے ہاتھوں قتل کرنے کی تمنا رکھتی تھی۔

” اور اگر خود مہارا خاتمہ ہو جائے تب، کیونکہ جنگ بہر حال جنگ ہے۔“

” اوه! میں ختم ہونا نہیں چاہتی، رایا نے اپنے سنہری بالوں کو جھڈکا دیتے ہوئے کہا۔ ”تا وقتیکہ میں کوئی نمایاں کام نہ کر جاؤں۔“

اس طرح اس حیرت انگیز لڑکی نے موت سے نفرت کا اظہار کیا وہ نفرت جو مادر روس کی محبت کی وجہ سے پیدا ہوئی۔  
ہاں۔ تم انہیں ختم نہیں کر سکتے نہ ہی انہیں الٹ بنا سکتے ہو۔ اور ساتھ ہی مجھے جرمن نشر کی ہوئی ایک خبر یاد آگئی۔

”شادی“ دھوکہ سے جس کے ذریعہ ہٹلریوں نے جرمن لڑکیوں کو بہکایا۔ اور یہ ریڈیو پر کہا گیا تھا۔

ایک سجا ہوا نفیس کمرہ جہاں سے محاذ کے لئے پیام نشر

کئے جاتے ہیں۔ تقریباً ایک درجن دلہنیں کمرے میں، موجود ہیں۔  
میز پر ایک قطار میں ڈلہوں کے فوجی تو در کئے ہیں۔ اور دہلے  
مخاڈ پر۔

جرمن فوج کی اعلیٰ کمان کے نمائندے سنجیدگی سے نشر  
کہتے ہیں کہ بیاہ شروع ہوا۔ یکے بعد دیگرے ڈلہن میکر و فون  
پر آتی اور ”ہاں“ کہہ دیتی ہیں اسی امتیاز سے جیسے بھیر۔ پھر  
یہ لیڈ بائی نذاحیہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور حقیقی دلہوں کی بجائے  
دوسرے ہٹلری جو پائے فیوہر ہر کی عنایت سے قائم مقام ہو جاتے  
ہیں۔ وہ انہیں۔ اپنے مراکز پر لیجاتے ہیں جیسے کہ وہ گائیں ہیں۔  
اور دو افتتاحہ سپاہی دہی آکر اس قسم کی اولاد کے اصلی باسپ کو  
تلاش کریں گے۔ دن دھاڑے ہٹلری لیٹرے معصوم لڑکیوں کا  
اعزاء کہتے ہیں۔ اب وہ روسی لڑکیوں پر اپنے ہاتھ پھیلا نا چاہتے  
ہیں۔ لیکن تم انہیں بیوقوف نہیں بنا سکتے روسی لڑکی بہر کیفیت  
ایک روسی لڑکی ہے۔ سو ویٹ لڑکیاں ان درندوں کے  
ہاتھ قطع کر دیں گی جو ان کی رسیلی جو انیوں پر پھیلائے جا رہے  
ہیں ان کی آزادی اور ان کے ملک پر۔

ساری تعریف و توصیف ان لڑکیوں کو نہ رہا ہے اور  
رایا کو جو اپنے ملک کے لئے، ساری انسانیت کی بہبود کیلئے  
برسر پیکار ہے اور نہیں یو پچنگو پر خضر ہے کہ مادر روس کیلئے اسکا جو دے سود نہیں۔

## ”انتقام“

جنگ کے اولین دنوں میں لیزا یرشوفا محاذ پر گئی۔  
 ”لیزا تم واقعی خوش قسمت ہو“ اسکے دوستوں نے کہا۔  
 جب وہ پچھنکے میں اسے رخصت کر رہے تھے۔  
 ہر کوئی ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہا  
 تھا۔ انکے ساتھ انکا تمام ضروری سامان اور اسلحہ تھے۔ اور  
 لینن گراڈ کی گلیوں سے گزرتے ہوئے وہ محاذ کے متعلق سوچ  
 رہے تھے کہ کس طرح وہ اپنے خون سے باہمی دوستی کا رشتہ اور  
 مستحکم کر سکیں گے۔

”ایس جا رہی ہوں“ لیزا یرشوفا نے کہا ”سنو، لڑکیو“  
 میں جا رہی ہوں“

وہ خوشی سے پھولوں نہ سماتی تھی۔ مسرت کے شرارے  
 اسکی آنکھوں میں دمک رہے تھے، کسی عمر سیدہ عورت نے  
 سنجیدگی سے کہا ”دیکھو، لیزا دیکھا یہ کوئی کھیں نہیں ہے کہ تم  
 جا رہی ہو۔ پیاری لڑکی۔ یہ جنگ ہے“

”مجھے معلوم ہے“ اسنے جواب دیا، اپنے گھنگر یا لے باؤں  
 والے سر کو جنبش دیتے ہوئے اسنے کہا ”مجھے سب کچھ معلوم ہے“  
 ”وہ فی الحقیقت کچھ نہ جانتی تھی۔ ایک زندہ دل لڑکی جسکی  
 عمر مشکل سے بائیس سال ہوگی۔ اس کا وطن جرمن فاسشیتوں  
 سے برسرِ پیکار تھا اور تمام جوان سال وطن کے بہادر سپوت محاذ  
 جا چکے تھے۔ اسے بھی چلا جانا چاہئے اسکے بھرتیلے بچکانی ہاتھوں  
 کو تیار داری اور نشانہ بازی کی کوفی مشق تھی۔

پھر لیزا بھی محاذ پہنچ گئی۔ کچھ ہی دنوں بعد اسکے چہرے پر  
 سختی آگئی اور اس کی ہیئت بدلنے لگی تب اسے معلوم ہوا کہ  
 جنگ کیا ہے۔ میدان جنگ سے اس نے اپنے ہاتھوں کئی ازخمی  
 ہیا ہی اٹھا لائے۔ جن کے چہرے خون میں لھوڑے ہوئے اور  
 درد و تکلیف کے باعث کچھ ہوتے تھے۔ بمب پھٹ رہے تھے۔  
 مشین گنیں چل رہی تھی، ہر طرف آگ ہی آگ۔ اور اسے آگ  
 تلے ریگنا ہوتا یہ ایک انتہائی خوفناک کام تھا۔

لیکن اس سے زیادہ خطرناک واقعہ بعد میں پیش آیا۔  
 ہاسپٹل کی نوجوان نرس پیچھے رہ گئی۔ اور اپنے سرخ فوج کے  
 سکشن سے علیحدہ ہوگی جب کہ اس مقام پر جرمنوں کی دہشت انگیز  
 قبضہ ہو گیا۔

فاسشست لباس میں درندے لڑس کے پرامن دیہاتوں

میں گھس آئے انہوں نے بوڑھے عورتوں اور مردوں کو جمع کیا اور  
باندھ کر دیباہوں کو ان پر سے گزار دیا۔ عورتوں اور لڑکیوں پر وہ  
جھیڑیوں کی طرح جھپٹ پڑتے

ایک جرمن افسر نے ایک عورت کو گرفتار کر لیا۔ اور اسے  
بہکنا ناچا ہا۔ لیکن ایک چھوٹا بچہ جو اس عورت کا تھا۔ غصہ کی  
کی حالت میں اپنی ماں پر ظلم ڈھانے والے پر ٹوٹ پڑا اور اس کے  
ہاتھ میں اپنے دانت گاڑ دیئے۔ اور اس درندے نے ماں  
کی آنکھوں کے سامنے بچے کا ہاتھ کر دیا۔ شدت غم سے ماں  
پر دیوانگی سی طاری تھی۔ ہاش پر گر کر وہ اپنے بچے کو جو مینے لگی۔  
فاشست درندوں نے ایک نوجوان لڑکی کو پکڑ لیا۔

جس نے ابھی ابھی عالم شباب میں قدم رکھا تھا اور اسے عذاب  
میں مبتلا کر دیا۔ اس نے بجا ڈکی کوشش کی چلائی ماں کو آواز  
دی۔ لیکن ظالم فاشستوں نے اسکی آنکھیں بھوڑ دیں  
پھر اس زخمی مجروح اور خون میں لتھری ہوئی لڑکی کا جسم ٹھیکوں  
میں پھینک دیا گیا۔

جرمن افسر اور سپاہی نوجوان لڑکیوں کو پکڑنے لگے اور انہیں  
حکم دیا "برہنہ ہو کر رقص کرو" لیکن ایک بھی لڑکی نے یہی جگہ سے  
حرکت نہ کی۔ تب ان کتوں نے انہیں مار ڈالا سارا علاقہ  
لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔

ان حالات کا لیزا ریشونا کو علم ہوا۔ جو یا تو اسکے  
عینی مشاہدے تھے۔ یا اس دہقان عورت کے جس کے مکان  
میں وہ پناہ گزیں تھی۔ لیزا نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ  
کس طرح ایک جرمن مرد از خور نے ایک دیہاتی سڑک پر  
معصوم بچوں کو مشین گن کی آگ کے سپرد کیا۔ اور ان کی  
نخنی نخنی خواں آلود لاشیں میدان میں پڑی تھیں۔

غم و غصہ سے نوجوان لڑکی کا خون ٹھونکنے لگا۔ اس کے  
دل میں ناسور یک رہے تھے۔ جو شیلی لیزا نے سوچنا "مجھے  
یہ مجلیت تمام ان ہنگوں سے انتقام لینا ہے، مجھے ان کی قوت  
کا اندازہ لگانا چاہئے، ان کے فوجوں کے حالات معلوم  
کرنے چاہئے، اور اس طرح میں انکی تباہی کے لئے سرخ فوج  
کی مدد کر سکوں گی" لیزا نے ایک دیہاتی دہقان عورت  
کا لباس زیب تن کیا۔ اور جیل ٹھوڑی ہوئی۔

اس جوان ہمت لڑکی نے اپنی زندگی خطرہ میں ڈاکر دشمن کی قوت  
اور فوج کا اندازہ لگایا۔ پھر اسے سرخ فوج کے کسٹن پہنچ کر، انہیں  
معلومات بہم پہنچائے۔ ہمارے جنگجوؤں نے کئی مستحکم فاسٹ  
گھر نسلے اڑائے۔

اسکی جدوجہد کارنامے اور بہادری کے صلہ میں حکومت نے  
ہاسپٹل نرس، کامسومو لکایر شونا کو انعام سے سرفراز کیا۔

## جھاد و نوک

ایک اجنبی مسرت کا احساس ہوتا ہے جب کوئی جنگی دوا خانے میں بحیثیت نرس کے کار فرما ہو۔ مسرت ؟ لیکن اس کام میں مسرت کیسے حاصل ہو سکتی ہے یہ ایک عام سوال ہے جو ہر ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے۔ لینا جھاد و نوک نے رخمیوں کے مر جھبا ہوئے چہروں پر غم جھلکتے ہوئے دیکھا۔ ان کی دل دوز آہیں سنی، اور انسانی خون اور دواؤں کی بوسونگھتی رہی۔ لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود وہ مسرور ہی تھی۔ اور شادمانی نے اس کے ہر عضو جسم اور اس کے خیالات گما دیا۔

یہ کیسے۔ کیا اس لئے کہ وہ وہیں تھی جہاں رہنے کی منتہی تھی۔ کوئی ہرج نہیں اگر لینا جھاد و نوک ایک مسلح فوجی نہ تھی۔ لیکن وہ مادرِ روس کے لئے اتنی ہی مفید ثابت ہو رہی تھی جتنی کہ ایک فوجی۔

لینا جھاد و نوک اس لئے بشاش تھی۔ کہ محاذ کے ایک دوا خانے میں وہ بید مستعدی اور جانفشانی سے اپنا فرض انجام

وے رہی تھی۔ ایک اجنبی انسان کے سر بالیں وہ کسی گہری سچ میں خرق تھی کہ دفعتاً یوں محسوس ہوا جیسے اسے پکارا جا رہا ہے اس نے پانی مانگا اور وہ اسکے خشک لہوں کے لئے ایک پانی کا پیالہ لے آئی۔ اس نے پڈیاں ٹھیک سے باندھنے کو کہا۔ شدت درد سے وہ بچوں کی طرح چلا رہا تھا اور بار بار اپنی پڈیاں نوچ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور اسے قریب کھینچا، وہ اپنی ماں اور بہن کو پکار رہا تھا۔ اور لینا اس سے اسی انداز میں مخاطب ہو رہی تھی جیسے ماں یا بہن۔ اسید طرح ینگ کیونسٹ لیگی چھا اور نوک جنگی دوا خانے میں کام کر رہی تھی۔ "اپنی غیر معمولی ہمدردیوں سے تم نے زخمیوں کے دل موہ لئے ہیں" ایک مجروح جنگجو نے لڑس لکھا۔ لینا ایک درد مند دل کی مالک تھی۔

زخمی سپاہیوں نے اسے اپنی رشتہ دار کا رتبہ دے رکھا تھا۔ اور وہ ہمیشہ سکر اتی رہی۔

وہ اس وقت بھی سکر اتی تھی جبکہ درندہ صفت جرمنوں نے ہسپتال کا محاصرہ کر لیا۔ اسکی خواہش تھی کہ جنگجو اسے ہمیشہ بشاش اور مطمئن پائیں۔ اور اس کی مسرت زخمیوں کی تسکین کا باعث تھی۔

مغربی محاذ پر آتشزدگیاں ہو رہی تھیں جنگ جاری

تھی جرمیوں نے ہسپتال پر بمب گراے اور ضروری تھا کہ زخمیوں کو منتقل کیا جائے آگ کے تلے جھاڑو لوک نے سپاہیوں کو سواریوں میں پہنچایا۔ خطرناک! ہاں یہ ایک خوفناک کام تھا۔ لیکن ایسے سمئے اسنے اپنی حیات کے متعلق کبھی نہ سوچا اسے صرف زخمیوں کو فاسٹسٹی بموں سے بچانے کا خیال تھا اسکے دل میں نفرت اور بغض کی چنگاریاں تھیں انکی طرف سے جو ہسپتال تباہ کر رہے تھے۔ اور اس نفرت نے خوف کو مٹا کر ایک دیر پا توانائی بخشی۔

ایک بار جب جنگ اپنے ارتقائی مدارج پر تھی لینا جھاڑو لوک نے ایک لفٹ کو ایک بچھلے جاتے ہوئے دیکھا یہ ننھی بیٹیم برہنہ لڑکی اسکی بیٹی تھی۔ اس کا چھوٹا سا تار تار لمبوس خون آلود تھا اور آنکھیں دہشت سے جم گئیں تھیں۔ لفٹ کا سانس پریشانی کے باعث پھول رہا تھا۔ اس نے لینا جھاڑو لوک کو بتلایا کہ کس طرح وہ سکشن کے ساتھ اپنے گاؤں سے گذرتے وقت بیوی بچوں کو دیکھنے گیا۔ لیکن اس نے صرف کھنڈر اور منہر چھوٹی کے درمیان اس کی بیوی اور بچے کی لاشیں پائی۔ یہ لڑکی خوفزدہ اور سہمی ہوئی "ماں۔ ماں" چلا رہی تھی۔

لینا جھاڑو لوک اس خون میں تھمری ہوئی لڑکی پر نظر کیا۔ جمائے سنتی رہی۔ لفٹ نے اپنی بیٹی اسکے بازوؤں میں دیدی۔

”اسے سنبھالو بہن! میں جا رہا ہوں۔ میں اپنی بیوی کے قاتلوں سے انتقام لوں گا۔ اپنے بچے کا۔ اس لڑکی کا۔ اور ان تمام بچوں کا انتقام جنہیں جرمنوں نے قتل کیا ہے۔“

وہ جلا گیا۔ لڑکی کے حلق میں سسکیاں سی ایلنے لگیں لیکن وہ انہیں نکل گئی۔ اسنے لڑکی کو ہنلا کر کیڑے پہناے اور اسی اثناء میں عہد کیا کہ اپنی تمام طاقت اور سارا خون محاذ کے کاموں کے تحت قربان کر دے گی۔

”میں بھی تم سے انتقام لوں گی۔ تم قابل ملامت دو پا یہ خونخوار درندہ۔“ لڑکی چلائی۔

لینا جھاوردونک اور زیادہ تن دہی سے اپنا کام کرنے لگی۔ اور ہر وقت وہ اسی فکر میں الجھی ہوئی رہتی کہ یہ کافی نہیں۔ وہ دقت بھی آجانا چاہئے کہ بالآخر وہ اپنے عہد کا یاسن کرے اپنی جانثاری کا ثبوت دے۔ مادر وطن کے لئے اور سو ویٹ عوام کے لئے۔ اور ناپاک فاشیتوں سے نفرت کے جذبات اسکے دل میں ابھرنے لگے۔

کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اسکی ہم عمر دوست کئی لڑکیاں محاذ پر کام کر رہی تھیں اور ثبوت دیدیا تھا کہ سو ویٹ لڑکیاں بزدل نہیں۔ میدان جنگ میں کہیں۔ نوجوان نرس کو لیکوفا آگ سے کھیل رہی تھی۔

اور زخمیوں کے علاج میں مصروف تھی۔ خوفناک۔ !  
 بلاشبہ یہ ایک خوفناک کام تھا۔ لیکن صداقت ہمیشہ خوفناک  
 ہی ہوتی ہے۔ کو لیکوفا، لینا جھادرو نوک کی طرح دشمنوں سے  
 متنفر تھی۔ انکا خوف اس کے دل سے مٹ چکا تھا اور وہ اپنے  
 کام میں مشغول تھی۔ ایک زخمی نے لڑکی کو مار دیا۔ وہ زمین  
 پر گر پڑی اور خون نکلنے لگا۔ لیکن اسنے اپنے متعلق کچھ نہ سوچا۔  
 کمانڈر کو لے جایا جانا چاہئے۔ انتہائی تکلیف کے باوجود وہ  
 سنبھل کر اٹھ کھڑی ہوئی ایک سرخ سپاہی کو آواز دی۔ وہ دو تو  
 نلکر اس زخمی سپاہی کو میدان جنگ سے اٹھالے گئے۔ اور  
 صرف اسی وقت اسنے حلق سے ایک دھیمی آہ پھسل پڑی۔  
 ”تمہیں کیا ہوا بہن“ سرخ سپاہی نے دریافت کیا۔

”براہ کرم — میرے زخم — پر — پٹی باندھ دو“  
 لینا جھادرو نوک یہ سب کچھ جانتی تھی۔ اس نے یہ تمام  
 باتیں سنی تھیں۔ اور وہ اپنی ہم عمر کامریڈس کے جرات آزما  
 حالات سنکر خوش ہوتی تھی۔ وہ کلاوا پائلوفا کے متعلق  
 جانتی تھی۔ کہ کس طرح اسنے اپنے جوان مضبوط کندھوں  
 پر پانچ زخمی سرخ سپاہی ان کے تمام اصلحہ کے ساتھ اٹھائے  
 تھے۔

اس نے کاٹیا ابراہموفا کے حالات بھی سنے تھے جو ایک

گوریلا لڑکی تھی۔ وہ بتیس (۳۲) زخمی سپاہیوں کو اٹھالائی  
پھر مہیب آتشزنگی میں کود پڑی اور جب جرمنوں نے  
مشین گن چلانے والے کو مار ڈالا تو وہ مشین گن بچھوٹ  
پڑی اور فاشست درندوں کو نشانہ بنایا۔

”بہت خوب کاٹیا براھموقا“ اس بے خوف  
لڑکی پر فخر کرتے ہوئے جو اسکی ہم عمر تھی لینا چلانی۔  
لیکن اسکے دل میں کوئی بات اٹھک رہی تھی اور  
اسکے ذہن میں ایک خیال الجھ رہا تھا۔

”لیکن میں — میں کیا ہوں — میں کب ثابت  
کر سکوں گی کہ موت میرے لئے کوئی حقیقت نہیں  
رکھتی — میں کوئی بڑا کام کر سکوں گی۔ ایک بڑا کارنامہ  
جو سرخ فوج کی اعانت میں ہو“

اور پھر لینا طول ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس  
ہسپتال میں کافی خاموشی اور سکوت ہے۔  
وہ دقت آگیا جبکہ جھاو رو نوک نے ایک سو تیس (۱۳۳)  
مجموع سپاہیوں اور کمانڈروں کی جانیں بچائیں۔

شہر یار تسون کے ایک ضلع میں جرمنوں نے ریل  
پر حملہ کر دیا۔ ٹرین رک گئی۔ اور بہر طرف آگ ہی آگ  
تھی۔ لینا اور اس کے چھ بڑے گارباں بال بچ گئے جبکہ

ایک سو تیس سپاہی بری طرح زخمی ہوئے اور حرکت کرنے کے قابل بھی نہ رہے تھے۔

وہ لڑائی مطلق ہراساں نہ ہوئی اور نہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ بلکہ نہایت جانفشانی سے اسنے زخمیوں کے پٹییاں باندھیں، انہیں پانی پلایا اور دیکھ بھال میں مصروف رہی۔ جبکہ جرمن ریلوے سڑک سے قریب جنگل میں موجود تھے۔

وہ باقی ماندہ سامان اور طبی سامان کے ڈبے کی محافظت میں رات بھر کھڑی رہی اور دن میں وہ زخمیوں کی بیماری داری اور خوش گپیوں میں مشغول رہی۔ ”ہم اب تک یہیں کیوں پڑے ہیں“ انہوں نے پوچھا ”لائن صاف نہیں۔ بہت جلد ہم روانہ ہو جائیں گے“ لینا نے کہا ”دن گذر گئے۔ اور وہ اپنی آخری روٹیاں کھا چکے۔“

”کامریڈ جھا ورونوک ہر اب غذا نہیں“ اسکی ایک اسٹنٹ نے کہا۔

”تمام واگنوں میں دیکھو“ لینا نے حکم دیا اور وہ سو سچنے لگی کہ کل ان زخمیوں کے کھانے کو کیا دیا جائیگا۔  
”بچھ آٹا ملا اور اسنے کہا کہ ہمیں پاس کے گاؤں

جا کر وہاں کی عورتوں سے مدد لینا ہوگی۔  
پھر اسنے گاؤں کی ایک کئی میں پہنچ کر تمام حالات  
بیان کئے۔

”عورتو۔ کیا تم میری مدد کرو گی۔ ہمیں زخمیوں کیلئے  
غذا ہیشا کرنی چاہئے“

”پیاری لڑکی۔ کیا ہم سمجھتے ہیں خود ہمارے اپنے  
بچے محاذ پر ہیں۔ ہم مدد کریں گے“

وہ عورتیں لینا کے ساتھ گئیں اور انہوں نے زخمیوں  
کے لئے غذاؤں کا انتظام کیا۔

پانچ روز اسی طرح گزر گئے۔ لیکن کوئی راہ نکالنی  
ضروری تھی۔

”ہم کیا کریں گے کامریڈ جھا اور دونک کیا ہم زخمیوں  
کو بچا سکیں گے“ اسکی ایک مددگار نے کہا۔

”ہمیں چاہئے کہ انہیں بچائیں۔ اور کسی بھی طریقے سے  
ہم ————— خیر میں انتظام کر لوں گی“

اسکے مددگار جانتے تھے کہ وہ اپنی جان کی بازی  
لگا دے گی۔ ”بہتر ہے تم نہ جاؤ بہن“ ایک نے کہا ”یہ

بہت خطرناک ہے مجھے جاننے کی اجازت دو“  
”بہن میں جاؤں گی۔ میرے لئے یہ کام آسان ہے“

میں اپنا لباس بد لکر ایک دہقان عورت کا بھیس بنے لوں گی اور لینا کسی قریبی سوویٹ ہسپتال کی تلاش میں نکل پڑی، ایک جرمن طیارچی نے اسے دیکھ لیا۔ طیارے نے غوطہ لگا اور آگ برسنے لگی۔ لیکن لینا ایک درہ میں روپوش ہو گئی اور پھر جنگل میں وہ چلتی رہا۔

آخر کار وہ ایک سوویٹ ہسپتال پہنچ گئی اور لینا اور اسکے ساتھی بہ ہزار وقت آتش و بارود سے کھیلنے ہوئے ان زخمیوں کو اٹھالائے۔

جب وہ ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئے تو لینا نے انہیں بتایا کہ کیا کیا گزری۔

جب فاشیت صفحہ ہستی سے مٹ جائے گی تو کموریان اور شاعر، مصور اور موسیقار سوویٹ لڑکیوں کے گن گائیں گے۔ اور اے بہادر سوویٹ لڑکیوں، نظموں، کہانیوں اور تصویروں کے ذریعہ تمہارے حالات قیام و حال تک پہنچائے جائیں گے۔

تمہاری شب بیداریاں۔ اپنے چہتوں سے پھیر کر کر آگ اور خون کی ہولی۔ زخمیوں کو دیا ہوا خون۔ اور تمہارے کارنامے بھلائے نہیں جا سکتے اے سوویٹ

بہادر لڑا کیو! —!

مادر وطن تم پر نازاں ہے۔

تمہارے قہقہے، تمہارے گیت، تمہارے رقص —  
 مد ظلم بڑا گئے۔ تمہارے دوست، بھائی اور سہیلیاں تم سے  
 جدا ہو گئیں۔ لیکن تم مایوس نہیں ہو۔ بلکہ جوان گرم خون کا  
 آخری قطرہ بھی سوویٹ مادر وطن کے لئے چھڑانے آمادہ ہو۔  
 تمہیں داسلیسا کو جینا یاد ہے جس نے ۱۹۱۲ء میں  
 دشمنوں کا مقابلہ کیا تھا۔

”میں کہتی ہوں تم لٹیرو۔ تمہاری قسمت میں بھی وہی لکھا ہے  
 میں نے ستائیس آدمیوں کی گردنیں ناپی ہیں ۷  
 یا تم ناڈ بچھڑا ڈرو فا کو یاد کر رہی ہو جس نے ایک تیز  
 رفتار گھوڑے پر سوا اپنے راستے کے دونوں جانب دشمنوں  
 کے سروں کے ڈھیر لگا دیئے۔

یا ٹائیٹاناسو لو ما کھا۔ ایک کزاک گاؤں کی معلمہ جس نے  
 اپنے ضعیف قوی کے باوجود کارہائے نمایاں انجام دیئے۔  
 سوویٹ لڑا کیو — تمہارے دل میں نفرت کی جوا  
 پھٹ پڑی ہو گئی۔ اور تم سوچ رہی ہو کہ ”میری زندگی میری  
 طاقت، میرا خون، میرا دل — محاذ کے لئے وقف ہے“ اور  
 ان فاشسٹ درندوں کو بتلا دو گی کہ روس کے سرسبز چمن

پر ماتھے پھیلانے کا انجام کیا ہوتا ہے! -  
 مجھے انکار نہیں۔ جنگ میں ہمیں مستعد رہنا ہو گا۔  
 جنگ۔ آسان نہیں۔ لیکن زیادہ کوشش کی ضرورت  
 ہے۔

ہمارے ساتھ ہمیشہ ایک جنگجو دوست ہے۔  
 اس سے سیکھو کہ وہ کس طرح لڑتی ہے۔  
 اور اسے طرح ہمارے سرخ فوجی، اور کمانڈر سوویت  
 لڑکیوں کے تذکرے کرتے ہیں۔  
 بڑھے چلو۔ پیاری سوویت لڑکیو۔ ہمارا وطن  
 تم پر نازاں ہے۔

## ایک عقیدتمند سپاہی

فروری کی ایک کہراؤ دوران کو میں دیر تک شہر کے جلسے ہوئے  
ویرانوں میں میجر یازدہیون کو تلاش کرتا رہا۔ جس کی بٹالین نے  
شہر کی مدافعت میں بڑا حصہ لیا تھا۔ میں شکستہ دیوار کے پاس سے  
گذر رہا تھا جس پر جا بجا بارود کے سیاہ دہبے اور دھوئیں کے نشانات  
تھے۔ آس پاس خراب و خستہ مکان تھے اور بالآخر ایک تباہ شدہ  
مکان میں مجھے میجر مل گیا جسے اس کے کامرٹڈ گھبرے ہوئے تھے  
اور وہ ایک چادر پر بیٹھا تھا جو رون پر کھچی ہوئی تھی۔ میں نے ایک  
باوقار آواز سنی اور ٹھوم کر دیکھا کہ ایک سپاہی جس کے بدن پر  
ایک گرم جاکٹ ہے کھڑا تھا۔

”یہ ہمارا کمانڈر ہے جس سے تم ملنا چاہتے تھے“ اس نے  
اپنی ٹوپی پر ہاتھ رکھتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

”ہاں — میجر یازدہیون“ میں نے جواب دیا۔  
”کیا تم اس کے ماتحت ہو؟“ سارجنٹ استخف  
سے دریافت کیا۔

”ہاں! ———“  
 ”معاف کرنا ——— تم دیکھتے ہو کہ ابھی ابھی میجر کے ایک گہری  
 چوٹ آئی ہے ——— اس کی بیوی ماری گئی۔ کیا تم فردرے  
 توقف کرو گے؟“

سارجنٹ نے ایک بار پھر اپنی ٹوپی پر ہاتھ رکھا۔ اور متحسب سوالیہ  
 نظریں مجھ پر گڑ گئیں۔  
 ”ضرور!“ میں نے کہا۔ میں انتظار کروں گا“ اور میں ایک  
 پتھر پر بیٹھ گیا۔

سامنے ایک مکان کا بلبہ پڑا تھا جس کی وجہ سے میں اس جانب  
 یازدہیوں اور اس کے اگر گردان افسروں کو دیکھ سکتا تھا جو اسے  
 گھیرے کھڑے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرہ پر شگفتگی نہیں  
 رہی ہے اور وہ مضمحل معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے ایک ساتھی کے سر پر  
 سے خلاؤں میں جھانک رہا تھا۔

اسی اثناء میں سارجنٹ یہ کہتے ہوئے میرے بازو پر پریچھ گیا۔  
 ”وہ دیکھا تم نے؟“

”میجر کی بیوی کون تھی“ میں نے دریافت کیا۔  
 ”وہ بھی رجمنٹ سے متعلق ہی تھی۔ شہر پر جب دوبارہ ہمارے  
 لوگوں نے قبضہ کر لیا تو ڈویژنل کمانڈر نے اسے ہسپتال کے  
 صلہ میں انعام دیا تھا۔ ہم نے اسے بہت ڈھونڈا لیکن وہ ہمیں

نہ مل سکی۔۔۔ بالآخر آدھ گھنٹہ پیشتر ہی میں اور میجر جنازے سے  
لوٹے ہیں۔ وہ جسمانی لحاظ سے کمزور تھی لیکن بلا کی بہادر۔۔۔  
میں نے اپنے ہاتھوں اس کی قبر کھودی ہے۔  
میں نے محسوس کیا کہ اس کی آواز اندوہناک ہوتی جا رہی ہے  
”اور میرا میجر“ سارجنٹ نے کچھ رک کر کہا ”انہائی دلیر  
آدمی ہے“

یستاخیف نے مجھے کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے وہ یہ یقین  
کرنا چاہتا ہو کہ میں اس کی باتیں تسلیم کر رہا ہوں۔ تب اس نے  
سر کو ہلکی سی جنبش دی اور سلسلہ گفتگو جاری رکھا۔  
”دوبارہ میں سے چنے لگا کہ میں اس کی مدد کے لئے کیا کر سکتا

ہوں۔ اگر میں اس کا قریبی دوست یا بھائی ہوتا تو۔۔۔  
لیکن اس صورت میں مجھے کیا کرنا چاہئے۔ صرف الفاظ سے تو کچھ  
نہ ہوگا۔ لیکن باقی امور تو بہت اہم تھے۔ ہماری ٹیالین سب سے  
پہلے شہر میں داخل ہوئی۔ میں شاید اس وقت میجر کے پہلو بہ پہلو  
تھا۔ لیکن وہ برابر مجھ سے آگے نکلا جا رہا تھا۔ اور اب جب کہ  
ہمیں جشن منانا چاہئے یہ ناشدنی واردات ہو گئی۔۔۔“

میں نہیں جانتا کہ میجر یازدہویں اس غم کو کیوں برداشت  
کر رہا ہے۔ لیکن میں ایسے محسوس کرتا ہوں کہ اس شخص کا غم  
بے نہایت ہے۔ اس کے الفاظ سے کمانڈر کی ذات سے اسکی

عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔

”کیا تم میجر کے ساتھ زیادہ عرصہ سے ہو؟“ میں نے پوچھا  
 ”جنگ کے تمام دوران میں“ اس نے فوراً جواب دیا۔  
 ”اب تک نین سال گزرے ہیں۔“

”کیا تمہیں معلوم ہے اس نے ایک بار میری جان بچائی  
 ہے۔ یہ سنیاؤں کے دلدلوں کی بات ہے۔ اس وقت وہ  
 پکستان تھا۔ اور ایک کمپنی کی قیادت کا فرض انجام دے رہا تھا  
 ہم ایک خندق میں گود پڑے اور ایک بمب نے میری بندوق کو  
 ازکار رفته کر دیا اور سامنے سے ایک دشمن مجھ پر حجر نوال رہا تھا  
 پکستان ہم دونوں کے مابین گود پڑا۔ دشمن نے اس پر حملہ کر کے  
 اس کے بازو کو زخمی کر دیا۔ لیکن میں نے اس وقت اس کتے کو  
 اس کے کینفر کو دار کو پہنچا دیا۔“

اس وقت یازدہ بیوف اٹھا اور دوسرے چند امنر بھی کھڑے  
 ہو گئے۔ میں میجر کے پاس پہنچا اور سار جنٹ یہ کہتے ہوئے  
 میرے پیچھے ہو لیا۔

”براہ مہربانی اس کے گھائل دل کو کریدنے کے لئے اس کی  
 بیوی سے متعلق کوئی سوال نہ کرو۔“

اس شام میں اور میجر مختلف مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔  
 بٹالین اس رات شہر میں ٹھہری تھی۔ اور ہم نے ایک مکان میں

قیام کیا جہاں سارا جنٹ نے شب بسری کا انتظام کر دیا تھا۔ یازدہویں نے دوسری بانوں کے سلسلے میں مجھ سے خود ہی اپنی بیوی کی موت کا ذکر چھپڑ دیا۔

”تمہیں شاید اس بارہ میں معلوم ہے۔“ اس نے خود ہی نتیجہ نکال لیا۔ ”میں نے تمہیں مام سے گفتگو کرتے ہوئے دیکھا ہے جس نے تمہیں اس سلسلہ میں سب کچھ بتایا ہوگا۔“

میں نے معلوم کیا کہ میجر سارا جنٹ کو ’مام‘ کہہ کر پکارتا ہے۔

”شاید۔۔۔“ میجر کہہ رہا تھا ”اس نے میرے لئے بستر کا انتظام بھی کیا ہے۔ تم وہاں لیٹ جاؤ۔ میں نہیں سوؤں گا۔“

میں نے ایسا ہی کیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں نے ایک آدمی کو میجر کے پاس پایا جو اپنی تمہنی پر تکیہ کئے بیٹھا تھا۔

”تمہیں کچھ دیر آرام کرنا چاہئے کامریڈ میجر“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”کیونکہ کل تمام دن ہمیں مصروف رہنا ہے۔“

رات گئے میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ میجر سو گیا ہے اور اس کا بدن سارا جنٹ کی گرم جبکٹ سے ڈھکا ہے۔ اور تاجیوف اپنے سر ہانے ہاتھ رکھے ٹھٹھرا ہوا پڑا ہے اور صبح کی اولین مدہم کرنوں کو مشرق سے ابھرتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔

یازدہویں کی بٹالین سے مجھے دوبارہ ٹی میں ملنے کا اتفاق

ہوا۔ اس مرتبہ وہ بالٹک کی سرحد سے قریب خیمہ زن تھے۔ زمین پر خشک زرد گھاس تھی۔ اور سرد ہوا کے جھونکے منظر کی دلکشی میں اضافہ کر رہے تھے۔ بٹالین جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

میجر یازدہیون رہنمائی کر رہا تھا اور مام بھی اسکے ساتھ موجود تھا جسے میں نے فوراً پہچان لیا۔ میں پہونچا تو سارجنٹ خندق سے پانی نکال رہا تھا اور ایک پرانے دوست کی طرح اس نے میرا سواگت کیا۔ جب یازدہیون ایک لمحہ کیلئے باہر گیا تو سارجنٹ نے کہا۔

”میجر نے مجھے تاکید کی ہے کہ میں کسی ایسے افسر یا دوسرے افراد سے اس کی بیوی کی موت کے متعلق کوئی گفتگو نہ کروں جو اس بارے میں کچھ نہ جانتے ہوں۔ مدت سے تعجب تھا کہ وہ اس بات کو پوشیدہ کیوں رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا۔“ اس نے مجھے عوز دیکھا اور کہنے لگا۔

”وہ نہیں چاہتا کہ سپاہی یہ خیال کرنے لگیں کہ اپنے انفرادی غم و غصہ کی وجہ سے وہ جرموں سے انتقام لے رہا ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ“ سارجنٹ مجھ سے کچھ قریب آ گیا۔ ”وہ ایک آہنی عزم و ارادہ کا مالک ہے اور ہماری فتح ہی وہ وجہ ہے جس کے لئے وہ زندہ ہے اور اس پر اس کا یقان ہے۔“

وہ کچھ اور کہنے ہی والا تھا کہ میجر لوٹ آنا اور سنا خیون اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ میجر کے ساتھ میں تھی گھنٹہ صرف کئے اور اس دوران میں میں نے دیکھا کہ اس کا ماتحت مستعد رہا۔ اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ میجر کے لئے اس کے دل میں بے پایاں محبت و عقیدت کے جذبات موجزن ہیں۔ انہی جذبات کی بنا پر اس کو جاننے پہچاننے والے اس کی قدر کرنے پر مجبور تھے۔ اور میں نے دیکھا کہ افسر اور دوسرے لوگ اس سے ادب و احترام سے مخاطب ہوتے اور خود میجر بھی اس کی بڑی قدر و منزلت کرتا۔ اور انتہائی خلوص سے بات کرتا تھا۔ لیکن جب ہم دونوں رہ گئے تو یازد ہیون نے کہا۔

”یہ بالکل میرے اپنے بھائی جیسا ہے۔ کسی شخص کو اتنا پر خلوص دوست نہیں مل سکتا۔ جب جنگ ختم ہو جائے میں اسے کہیں نہ جانے دوں گا۔ بلکہ آئندہ میں اسے اپنے ساتھ رکھوں گا۔“ اس شام جنگ نے شدت اختیار کر لی اور یازد ہیون بار بار اپنے ماتحت کو ادھر ادھر احکام صادر کرنے بھیج رہا تھا۔ اور واپسی پر سنا خیون ایک تجربہ کار سپاہی کی طرح تقبیلی اطلاعیں دیتا۔

رات ہونے ہونے صورت حال اور بھی نازک ہو گئی سلسلہ پیام رسانی برابر جاری تھا۔ اور سار جنٹ اپنے فرض

کی انجام دہی میں بکمال مستعدی مصروف و مشغول تھا۔  
صبح کو میں تین تا حیوں کو پھر دیکھا۔ بٹالین اب کچھ تازہ دم  
سی تھی البتہ سارجنٹ لڑتے ہوئے زخمی ہو چکا تھا۔ مجھ سے کہا  
گیا کہ وہ اپنے کمانڈر سے قریب کھڑا تھا اور ان جرمن نشانہ بازوں  
کی زد میں آ گیا جو میجر کو ہدف بنائے تھے۔

چار سپاہی سارجنٹ کو چادر پر لٹائے آہستہ آہستہ لے  
آئے میجر ان کے پیچھے تھا۔ اس کی اپنی ٹامی گن اس کے سینے پر  
تھی اور ہاتھ میں سارجنٹ کی گن تھی۔ زخمی کا چہرہ سیاہ پڑ چکا تھا  
سامنے سرک پر ایک لاری کھڑی تھی۔ اور سپاہی سارجنٹ کو  
وہاں لے چلے میجر بھی وہاں پہنچا۔

”اب کیا حال ہے۔۔۔“ یازد ہیوں نے پوچھا۔  
”کچھ نہیں۔۔۔“ سارجنٹ نے جواب دیا۔ ”ایک معمولی  
سازختم ہے بس۔“

”جلد اچھے ہو جاؤ۔۔۔“ میجر نے اپنے عام انداز میں  
کہا۔ لیکن پھر فوراً ہی اس کا لہجہ بدل گیا۔ ”تمہارے بغیر مجھے  
بڑی مشکل ہوگی۔“

ڈرائیور نے موٹر آگے بڑھائی۔ سپاہیوں نے اپنا بوجھ  
اوپر اٹھایا تاکہ اسٹریچر پر رکھ دیں۔  
”کامریڈ میجر۔۔۔“ سارجنٹ نے متانت سے کہا۔

---

کیا تم ایک لمحہ کے لئے میرے قریب آؤ گے۔ پھر میں سن نہ سکا کہ  
سارجنٹ نے کیا کہا۔۔۔۔۔ میجر نے اپنے ماتحت کو چوما۔  
اور پلٹ کر اپنے کام پر روانہ ہو گیا۔

---

---

---

## سب کا درخت

پناہ گاہ میں بیکامی روشنی گل ہو گئی اور سر اسگی کے عالم میں چنچوں اور کرسیوں کے ادھر ادھر سر کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ دفعتاً ایک بلند آواز گونج اٹھی۔

”خاموش کامرٹرز۔ اطمینان سے جہاں ہو وہیں بیٹھ رہو کوئی غیر اطمینانی حالت رونما نہیں ہوئی ہے“

اور وہ سب تاریکی میں اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ حمد کئی گھنٹوں کے لئے ملتوی رہا۔ آرٹسٹ اپنے اسٹول پر بیٹھ گیا جس پر وہ ہمیشہ تصور کشی کے وقت بیٹھتا تھا۔ یہ بلکاتین ٹانگوں والا اسٹول جسے اس نے خود اپنے ہاتھوں بنا یا تھا۔ اس کے لئے بڑا کارآمد ثابت ہوتا تھا۔ آرٹسٹ پیر و گراڈ موضع کے ایک چھوٹے سے یکمیزہ مکان میں رہتا تھا جس کے ارد گرد اسی قسم کے اور مکان تھے اور کئی انقلابوں اور جنگوں نے ان میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی تھی۔ اس چھوٹے سے مکان کے آگے ایک چھوٹا سا باغ اور ایک پرانا خراب و خستہ فوارہ بھی تھا جس پر اب برف جمی رہتی ہے۔ گذشتہ لمحہ آرٹسٹ نے صرف اپنے باغ مکان اور

فوارہ کے متعلق ہی سوچا۔

اس نے اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کی مختلف آوازیں  
سنیں، خطرات کے تذکرے، بچوں کے رونے کی صدائیں دروازے  
کے کھلنے بند ہونے کی آواز — اور منظر پر ہر طرف تاریکی  
چھائی ہوئی تھی — گہری تاریکی۔

”مجھے بہت عرصہ پیشتر لینن گراڈ سے چلا جانا چاہئے تھا“ ایک  
ایک آواز نے متاسف انداز میں کہا۔ ”ہاں“ — آرٹسٹ نے  
اسے اپنے بارے میں سمجھا۔ ”میں نے بھی نہ جا کر کسی حماقت کی ہے“  
یہ تاخیر کوئی بزدلی پر محمول نہ تھی بلکہ وہ پوسٹروں کے بارے میں  
سوچ بچار کر رہا تھا۔ ان پوسٹروں کے بارے میں جو بیحد مقبول  
تھے اور گلیوں، کلبوں اور محاذ پر پھریں لگائے جاتے تھے۔ یہ ٹھیک  
تھا لیکن ضروری نہیں کہ یہ کام لینن گراڈ ہی میں سرانجام دیا جائے  
لیکن اب تو حالات اتنے پیچیدہ ہو گئے تھے۔ کام کرنا بھی دشوار  
ہو چلا تھا۔ اسٹوڈیو میں کافی سردی تھی۔ اتنی سردی کہ اس کی  
ٹھٹھری ہوئی انگلیاں مشکل سے پنسل بھی تمام سکیں۔ چھوٹا سا  
اسٹو اس قابل نہ تھا کہ گرمی پہنچا سکے اور کوئی دوسری ترکیب  
بھی نہ تھی۔ اس کے چھوٹے سے مکان میں پناہ گاہ کا انتظام بھی  
نہ تھا۔ اس لئے اسے ہر مرتبہ اس بڑی پناہ گاہ میں بھاگ آنا اور  
گھنٹوں بیٹھنا پڑتا تھا۔ اس پر سردی کا حملہ ہو گیا تھا اور وہ

بری طرح کھانسی میں مبتلا تھا۔ مدت سے اسے معقول غذا بھی نہ ملی تھی۔ اور اس کے لئے اپنے مکان سے دور پیدل چلکر آرٹھٹ کلب پہنچنا بھی مشکل تھا۔ گلیوں میں موٹر بھی نہیں دوڑ رہی تھیں اور نہ ہی سڑکوں پر روشنی تھی۔ اس سے کہا گیا کہ اگر وہ والکا پہنچ جائے تو اسے منور سڑکیں، روشن اور آرام دہ کمرے اور معقول غذا دستیاب ہو سکتی ہے۔ وہاں اس کے وہ ساتھی بھی تھے جو پہلے جا چکے تھے۔

ہاں — اس تاریکی میں بیٹھے رہنا کتنی حماقت خیز بات ہے سڑی سے ٹھٹھے ہوئے بھوک سے بے تاب اس وقت تک انتظار کرو جبکہ کہ کسی ساتھی کے سر پر بمب آگے۔

بار بار مکان ادھر رہا تھا۔ ہر فرد خاموش تھا۔ اور چند لمحوں تک دہاکوں کی آوازیں آتی رہیں۔ تب کہیں سکوت چھا گیا اور تاریکی اور ہری ہوئی گئی۔ آرٹھٹ کو وقت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ وہ پناہ گاہ میں سہر شام داخل ہوا تھا اور اب تو کافی وقت بیت چکا قدرے توقف کے بعد پھر ایک دہاکا سنائی دیا۔ ایک اور دہاکا —

ایک اور — ”وہ بمب پھینک رہے ہیں“ — اس نے سوچا۔ اس کا محبوب شہر کتنا متغیر ہو گیا۔ یہ خیال اندوہناک اور غم آگین تھا۔ انٹارڈ انگیز اور المناک کہ کسی کی آنکھوں میں آنسو اُبل آئیں۔ بہت جلد خطرہ کا الارم ختم ہو جائے گا اور وہ ان گلیوں میں داخل ہوگا جہاں مکالموں پر تازہ بربادیوں کے آثار ہوں۔ وہ

مکان جو کچھ ہی میرے پیلے زندگی کے گہوارے تھے اب خاک کا ڈھیر اور  
نبا ہیوں کی مجسم داستان ہوں گے۔

ایک گوشہ میں کسی روپوش بچہ کی روئی آواز آرہی تھی۔ آرٹسٹ  
نے چاہا کہ اس مغموم بچہ کا خاکہ کھینچے جس کی آنکھیں نمناک ہو چلی ہیں  
شاید وہ سو گیا تھا اور اچانک جاگ اٹھا ہے۔ اور تاریکی میں دہشت  
کے مارے رو رہا ہے۔ کیا وہ کسی پناہ گاہ کی تصویر بنا سکے گا۔ ایک  
ایسی ہی پناہ گاہ جہاں موم بتیاں جل رہی ہیں اور ان کی مدہم روشنی  
میں کچھ انسانی چہروں کے نقوش ابھر رہے ہیں دیواروں پر سیاہ  
سائے اور مہم شکلیں۔ گرم ملبوسات میں ایک بوڑھی عورت  
کسی گوشہ میں آہستہ آہستہ گفتگو کرتے ہوئے نوجوان، جوان  
ماؤں کے سینوں سے چپٹے ہوئے شیر خوار بچے۔

اس دور ابتلا میں آرٹ کے لئے بڑا نازک موقع آرٹسٹ کا تھا  
قدیم فنکاروں نے ماضی کی عظیم الشان داستانوں کو پیش کیا ہے  
دگویا، نے لینن گراڈ کو اپنے رنگ میں بیا کی اور استقلال سے پیش  
کیا تھا۔ آج سے ایک صدی پہلے ”میں نے یہ دیکھا —“  
زینہ پر ایک روشنی جگمگا رہی تھی۔ اور کھلے دروازوں سے  
خطرہ ختم ہونے کے سگنل کی آواز آرہی تھی۔ آخر کار حملہ  
ختم ہو گیا۔

آرٹسٹ نے کوئی محبت نہ کی۔ اس نے اس وقت تک

انتظار کیا جبکہ مجمع تاریکیوں کو چیرتا ایک تنگ دروازے سے  
گذر نہ گیا۔ سب سے آخر میں وہ سرد دیواروں سے ہوتا ہوا باہر نکلا  
اسے خوف تھا کہ گلی میں داخل ہوتے ہی اسے تباہ شدہ مکان  
نظر آئیں گے اور اپنے مختصر مکان تک پہنچنے کے لئے ان شکستہ  
گھروں سے ہو کر گذرنا ہوگا۔

جیسے ہی کہ وہ گلی میں داخل ہوا وہ سر اسبگی اور استعجاب  
کے عالم میں ٹہر گیا۔ سارا منظر چاند کی سنورکروں سے مامور تھا۔  
مکانوں کی دیواروں سے اوپر دور آسمان پر چاند مک رہا تھا۔ جسکے  
ارد گرد سفید اور نیلگوں بادل منڈلا رہے تھے اور ایسے محسوس ہوتا تھا  
کہ بھٹروں کے گلے رواں دواں ہیں۔ فضاؤں پر کھر چھائی ہوئی تھی۔  
اور آسمان پر جیسے نمی اور نور باہم خلط ملط تھے۔ مکانات سے آگے  
دور تک کھلا میدان تھا اور پیروں تلے ہر کہیں برف بکھری ہوئی تھی  
ادھر ادھر بکھرے ہوئے سائے عجیب منظر پیدا کر رہے تھے۔

وہ اپنے مکان کی طرف بڑھنے لگا۔ وہاں اس نے خود کو ایک  
باغ میں پایا جو خواب سے زیادہ حسین تھا۔ درختوں پر کھر جمی ہوئی  
تھی۔ اور ہر طرف روشنی سی پھیل رہی تھی جیسے آرسٹک کے ارد گرد  
درخت رقص کر رہے ہوں۔

اس معجزاتی باغ کے وسط میں ایک درخت عجیب دلربا یا نہ  
انداز میں ساکت و صامت کھڑا تھا۔ آرسٹک ایک ادھیڑ میں مبتلا

تھا وہ اس جگہ کو پہچان نہ سکا اسے یہ بھی یاد نہ تھا کہ وہ یہاں تک کیسے پہنچا ہے۔ اور یہ باغ کس کا ہے۔

اس نے اس پاس نگاہ دوڑائی راستے پر لوگ بیل پھر رہے تھے قہقہوں کی آوازیں سرد فضاؤں کو چیرنے لگیں۔ اس نے اپنی گرم اونٹنی لٹوٹی اتار لی اور کچھ دیر وہیں ٹھہرا رہا۔ تب اس کے ہوش و حواس بجا ہوئے اور وہ اپنی صوحیت سے جاگ اٹھا۔ وہ اپنے ہی باغ میں تھا۔ اور اس فوارہ کی جانب آگے بڑھ رہا تھا۔ جس پر برف کی تہیں جم گئی تھیں۔ اس نے وہ باڑہ کیسے پھلانگی جو باغ کے اطراف گھری ہوئی تھی؟ اس نے دیکھا کہ باڑہ وہاں سے فائب ہے اور ایک زبردست دہماکے نے اسے گھلی کے اس جانب ڈال دیا ہے۔ وہ درخت اس کا پرانا سبب کا درخت تھا جو ہمیشہ سے فوارے کے پاس استادہ ہے اور سامنے اس کا اپنا تاریک مکان موجود ہے۔

اس نے اپنے اطراف ایک نگاہ ڈالی اور دیکھا کہ شہر چاند کے نور سے تہا رہا ہے۔ اور اس کے محبوب شہر کی آبادی دور دور بکھری ہوئی آبادی ایک خاموش حن کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔

آرٹسٹ نے اس آبادی کو غور سے دیکھا جیسے اس نے نیا جنم لیا ہو۔ وہ سارے پریشان کن خیالات جو پناہ گاہ میں اسکے ذہن میں پیدا ہوئے تھے نچو ہو گئے۔ یہ محنت، محبت حن اور بہادری کی دنیا کتنی خاموش تھی۔

اس شہر کی مدافعت آخری سانس تک کی جانی چاہئے۔ آخری  
 قطرہ خون تک، دشمن کو ان دیواروں سے ٹکرا کر لوٹنا ہوگا۔ اور  
 اس کی شکست ناگزیر ہے۔  
 آرٹسٹ وہیں استاد تھا، اور اس کے دل میں  
 مسرت استعجاب اور فخر کے جذبات موجزن تھے۔

## سن رسیدہ سورما

وہ بہت بوڑھا تھا اور اس کا آنکھوں سے شکل سے سمجھائی  
دینا تھا۔ وہ سب کھلے درتے بچے کے پاس کھڑے تھے۔ وہ بھی ان لوگوں  
کے پاس پہنچا لیکن اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اس لئے اس نے  
دریافت کیا۔

”کیا ہوا ہے؟“

وہ دور کہیں۔ شہر کے اوپر دھویں کے گہرے بادل منڈلا رہے  
ہیں۔ جیسے دھویں کے عظیم پہاڑ اور ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی  
میں اس کے کنارے روشنی مائل ہیں۔ دھواں اب گہرا اور نیلگوں  
ہو چلا اور اپنے انتہائی مدارج طے کرنے لگا۔

”یہ کیا ہے۔۔۔ آگ آتشزدگی۔“ وہ دریافت کرنے لگا  
”کیا یہ جرموں کے کر توت تو نہیں؟“  
”ہاں۔“ اس سے کہا گیا۔

طیارہ شکن تو ہیں ابھی برس رہی تھیں لیکن زیادہ سرعت سے  
نہیں۔ وہ رات میں اپنے نقشے دیکھا کرتا تھا۔ وہ ایک سن رسیدہ  
جغرافیہ کا فوجی معلم تھا۔ اور ایک موجد۔ اس کے پاس کئی نقشہ تھے

ان نقشوں پر پھیلے ہوئے نیلگوں، بھورے، ہیرے اور زرد رنگ سے  
پدے اس نے ایک عظیم ملک کی زندگی دیکھ پائی۔ ایک وسیع، آزاد  
اور ابھرتے ہوئے ملک کی زندگی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے نقشہ سال  
بہ سال کیسے بدلتے جاتے ہیں اور اب جب کہ اس لینن گراڈ کے نقشہ پر نظر  
ڈالی تو اس کی بھویں سکڑ گئیں اور پیشانی پر شکنیں آگئیں۔

جرمن لشکر پارک کی سمت آگے بڑھ رہے تھے۔ گا پھینہ ان کی  
زد میں تھا۔ پیٹر ہوف مسخ ہو چکا تھا۔ اور شین گنوں کی آوازیں  
کالپینو سے بہ آسانی سنائی دینی تھیں۔

”ہنیں یہ ناممکن ہے“ اس نے خود سے کہا۔ ”یہ نہیں ہو سکتا  
کہ جرمن لینن گراڈ میں داخل ہو جائیں۔ یہ شہر کبھی کسی دشمن سے محصور  
نہ ہو سکا۔ میں اسے نہیں مان سکتا۔ میرا ذہن اسے قبول کرنے سے  
انکار کرتا ہے۔ یہ شہر کبھی مفتوح نہ رہا کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔“  
اس نے احتجاجاً اپنے آتشیں شیشے کو دور پھینک دیا۔

”اور یہ شہر جرمنوں کا مفتوح ہوگا۔ ان درندہ صفت جرمنوں،  
ان نازی بھیلوں کا جو عورتوں اور بچوں کے خون کے تک پیاسے  
ہیں، ان فاشستوں کا۔“

”ہنیں نہیں“ جرمن جرنل جنگ کے طریقوں سے واقف ہیں  
ان کی تنظیم مستحکم ہے۔ اور وہ جانتے ہیں لڑائی کیسے لڑی جاسکتی ہے۔“  
”لیکن کیا وہ لڑنے کے طریقے جانتے ہیں۔“ دوسرے ہی لمحہ

وہ چلایا۔ ”وہ خونِ درندے نیتے لوگوں پر وار کرنا، تباہیاں پھیلانا اور آتشزدگی سے واقف ہیں۔ لیکن اب یہ نہ ہو سکے گا۔ ہم ان کے جاں میں نہ آئیں گے۔ روسی عوام اتنی آسانی سے زیر نہیں ہو سکتے تم لینن گراڈ کبھی حاصل نہ کر سکو گے“

وہ اپنے بستر پر دراز ہو گیا لیکن نیند نہ آتی تھی۔ اور شہر کے ارد گرد جو لڑائی ہو رہی تھی اسی خیال میں وہ مستغرق رہا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اکناف شہر کا سارا منظر اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ وہ عمارتیں اور وہ مقامات جہاں نصف صدی پہلے وہ ایک افسر تھا اور اپنے فرائض کی پابجائی کر رہا تھا۔ لیکن دہشت اور سرسبکی نے ان خیالات کو محو کر دیا۔ شاید دشمن کے دباے شہر کے مضافات میں داخل کر چکے تھے۔ اگر فی الواقع ایسا ہوتا تو وہ کم از کم دستی بمب پھینکنے کی طاقت تو ضرور رکھتا ہے۔ وہ یہ کبھی نہیں دریافت کر سکا کہ ”وہ کتنے ہیں“ یہ درست ہے کہ اس کی بصارت کمزور تھی لیکن وہ یہ دریافت کرے گا۔ ”وہ کہاں ہیں — لیکن نہیں۔ جرمن ان مقدس راہوں پر کبھی نظر نہ آسکیں گے، کبھی نہیں“

جب ہوائی حملہ کا الارم بجا تو وہ پناہ گاہ میں نہیں گیا۔ مکان ایک دہانے سے متزلزل ہو گیا۔ چھت پھٹ پڑی در پچھلے اڑ گئے۔ لیکن اس نے صرف اتنا ہی کہا

”اے خونِ درندو! اب تمہاری زندگی خیر بھی خیر نہیں۔“

لڑائی شدید تر ہوتی گئی اور لینن گراڈ کی سرحدوں پر دشمن پہنچ گئے۔ سرما آیا اب مکان تاریک اور سرد تھا۔ انگھٹی میں کچھ بدہم شرار سے دھک رہے تھے اور کسی قدر گرم فضا پیدا ہو گئی۔ بڑھے کے لئے ہردن مشکل سے گذرتا۔ وہ کسب میں لیٹا پڑا رہا۔ اور ساری زندگی اس کی آنکھوں کے آگے سے گذر گئی۔ وہ ایک طویل، پر از محنت اور دلچپ زندگی تھی۔ شاید وہ بھی کوئی حصہ لیتا مسگر اس کے اعضا میں اتنی سکت نہ رہ گئی تھی۔

اپنے در پیچے کے باہر دور دور تک پھیلے ہوئے شہر کے متعلق اس نے سوچا جو محنت اور جنگ کے دور سے گذر رہا تھا۔ آس پاس کی راہوں پر ہر کہیں بمب بھٹ رہے تھے۔ اور ان کے دہاکوں کی آوازیں اس کے لئے پریشان کن اور تکلیف کا باعث تھیں۔

ان جذباتی تلحوں میں جب کہ اس کے خیالات میں ایک تلاطم سا پیدا ہو جاتا وہ اپنے منیر کی دراز سے اپنی سنہری دستی گھڑی نکال لیتا اور اپنی کٹائی پر باندھ لیتا تھا۔ یہ گھڑی اسے فوج کے تدریس میں سماں حصہ لینے کے صلہ میں دی گئی تھی۔ جہاں اس نے کئی سال تک تعلیم دی اور بیسیوں نوجوانوں کی تربیت میں مدد دی۔ ذہن اور بہادر کامریڈز۔ اسے ان کے متبسم چہروں کا خیال آیا۔ ان کی نوجوان روح اور ان کے دلچپ مباحث کا۔ اور پھر اچانک اس نے انہیں دیکھا۔ نوجوان گھوڑوں پر سوار بلند پہاڑیوں، چشموں، دریاوں اور کاکیشیا کی

چڑھائیوں کو عبور کرتے ہوئے —

وہ بہت نحیف ہو چلا تھا۔ اسے اپنی غذا کھانے تک کے لئے تامل ہوتا تھا۔ اور اس کی لڑکی کو کھلانا پڑتا۔ کھانے کے دوران میں وہ اسے محاذ کی تازہ ترین خبریں سناتی تھی۔

”ہر میت، ہمیشہ ہر میت“ وہ بڑبڑاتی، دبی ہوئی معنوم آواز میں اور اس کی کمزور آنکھیں اپنی بیٹی کے چہرے پر گڑجاتیں۔

”بڈھا زیادہ دن نہیں جسے گا“ ہمسائے کہتے تھے۔

ایک حسین صبح لڑکی نے اپنے باپ کے کمرے سے عجیب آوازیں سنیں۔ پہلے اسے ایک کلہاڑی کی آواز آئی۔ پھر شہوڑے کی اور پھر گانے کی آواز۔ ہاں۔ کمرے میں کوئی گارہا تھا۔ الفاظ مبہم تھے بلکہ اس گیت میں کوئی خاص الفاظ ہی نہ تھے۔ وہ صرف گنگانے کی آواز تھی۔

جہاں تک اسے معلوم تھا، بڈھا اپنے پرانے کبیل میں لپٹا ہوا پڑا رہتا۔ مضحل اور پست۔

وہ دروازے کی طرف آگے بڑھی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ دیکھا کہ اس کا بوڑھا باپ گارہا ہے۔ ہاں بوڑھا ہی گارہا تھا اور اس کی آنکھیں روشن تھیں۔ اس کے کندھوں پر ایک پرانا اوور کوٹ پڑا تھا اور بہت بجلا معلوم ہو رہا تھا۔

”ابا۔ تمہیں کیا ہوا ہے؟“ وہ چلائی ”تم کیوں اٹھے اور یہ کام

کیوں کر رہے ہو تم میں ان کاموں کی طاقت کہاں۔“  
 اس نے بیٹی کو غور سے دیکھا۔ اور پھر صاف اور واضح آواز  
 میں جواب دیا کہ ”کیا تم نے آج صبح ریڈیو نہیں سنا۔“  
 ”نہیں“ اس نے جواب دیا۔ ”اس میں کیا کہا گیا“  
 بڑھا آدمی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ہتھوڑا تھا  
 اور دوسرے میں کلہاڑا۔

”تم نے نہیں سنا“ ساری دنیا نے سنا اور تمہیں کچھ بھی  
 معلوم نہیں۔ جرمن ماسکو کے آس پاس سے مار بھگا دئے گئے۔ میں  
 کہتا نہ تھا۔ وہ جنگ کیا جانیں، ان کی لڑائی کے طریقہ بالکل لٹیروں  
 جیسے ہیں۔ انہیں ہزیمت اٹھانی پڑی۔ سمجھ گئی تم۔ ماسکو میں اس  
 پسپائی کے بعد وہ لنین گراڈ حاصل نہ کر سکیں گے۔ جب میں نے یہ  
 خبر سنی میں چپکالیٹا نہ رہ سکا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے زور سے  
 چلایا۔ ”فتح زندہ باد — فتح پائندہ باد“ یہ نعرہ لیٹے ہوئے کیسے  
 لگایا جاسکتا تھا۔ یہ جوش اور بہادری کا نعرہ — عظیم سوویٹ  
 عوام کی فتح کا نعرہ۔

# نئی زندگی

وہ سراسیمگی اور استعجاب کے عالم میں مہبوت کھڑا تھا۔  
 ”مجھے تمہارا کھوج لگانے میں بڑی دقت پیش آئی۔ ایک مرد اپنے  
 مکان کو اتنی رات گئے لوٹتا ہے؟“  
 اس نے اپنی ٹوپی سے برف جھاڑتے ہوئے کہا۔  
 ”کیا وہ ہسپتال میں ہے؟“  
 ”جی ہاں“ اس سے کہا گیا ”کیا ہوا اُسے“  
 ”کیا ہوا؟ — وہی۔ جو ایک عورت کو نئی زندگی کے جنم دیتے  
 سسے ہوتا ہے اور کیا“  
 ”اور تم کون ہو؟“  
 ”میں اتفاقاً اپنی ڈیوٹی سے لوٹ رہی تھی۔ ہمیں عجلت کرنی پڑی تھی۔  
 میں تمہیں راستہ بتاتی ہوں —  
 عجیب اتفاق ہے۔ میں یہاں سے گزر رہی تھی اور وہ یہیں تھی۔  
 ہمارے علاوہ ایک شخص بھی نہ تھا۔ میں اس کی کیا مدد کر سکتی تھی۔  
 کیونکہ میں کوئی دایا تو ہوں نہیں۔“

کچھ دیر بعد ارنیا جو ایک ہسپتال کی ملازمہ تھی اور ایک اجنبی داخل ہوئے۔ وہاں کافی تاریکی تھی۔ ایک تاریک مکان سامنے تھا اور کوئی روشنی نہ تھی۔ گلیوں میں کھراؤدہ راستوں پر اسکاؤٹ ادھر ادھر حرکت کرتے نظر آ رہے تھے۔

پکا ایک وہ برف میں دھنس گئے۔ ایک باریک چھتی ہوئی آواز سنائی دی۔ جو قریب تر آئی گئی۔ انھوں نے بازوؤں سے اپنے سر چھپائے۔ پاس ہی کہیں سے سرخ سرخ شعلے اوپر کواٹھنے لگے۔ اور ایک دہاکہ کی آواز سنائی دی۔ اور سامنے والے مکان کا کچھ حصہ زمین پر آ رہا۔

”مجھے امید ہے کہ اسے کوئی ضرر نہ پہونچا ہوگا“ ارنیا سے دریافت کیا گیا۔

”نہیں وہ دوسری جانب ہے۔ آج رات حملہ بہت شدید ہے اور میں نہیں چاہتی کہ گھر پہونچنے سے پہلے مجھے کوئی ضرر پہونچے۔“

”ارنیا یہ بیاروں کے ملاقاتیوں کے کام پر متعین تھی بیاروں کے کام سے اسے کوئی سروکار نہ تھا لیکن رات کی بھیانک تاریکی میں اس نے ایک عورت کی مدد کی جبکہ وہاں اور کوئی اس کی مدد کو موجود نہ تھا۔ رات ہییب اور تاریکی سنگین تھی، سریر شدید حملے کے امکانات تھے۔ ارنیا اور اس کا ساتھی کھراؤدہ فضاؤں میں دوڑے اور کچھ کچھ فاصلہ پر حملوں اور دہاکوں کی آوازیں سنتے رہے۔“



فضا میں بلند کیا۔ جیسے کہ وہ اس عظیم شہر کا معائنہ کر رہی ہو جو تاریکی کی چادر لپیٹے ہے۔ پھر اس نے اپنے گرم کوٹ میں اسے بحفاظت تمام چھپا لیا۔ اور اپنے کوٹ پر کی برف جھاڑ دی۔

اس کے پیچھے ماں نے اپنے تھکے پیر اور مضحل اعضا پھیلادئے اور مدہوش سی پڑی رہی۔ پھر اس نے اپنے پڑ مردہ لب واکئے۔  
 ”میں خود چل سکتی ہوں“ — اس نے عورت کی مدد کی اور اسے کھڑا کر دیا۔ ”ہمیں جلد وہاں پہنچنا چاہیے۔ وہ اب کچھ دور نہیں۔“

برف ان کے چہروں سے مس ہوتی رہی۔ سرد ہوا میں اٹھکھلیا کر رہی تھی اور وہ آگے بڑھنے لگے دیکھوں کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں لیکن وہ فاتحانہ انداز میں آگے بڑھتے رہے ضرورت ہوتی تو یہ جلوس، یہ مختصر سا شانہ جلوس پورے شہر سے گذرتا۔ ایک معصوم نوزائیدہ انسانی وجود کو لئے ہوئے جس نے ان دہشت انگیز لمحوں میں اپنی آنکھیں کھولی ہیں۔

ماں پہلے ہی سے جانتی تھی کہ اس نے ایک لڑکی کو جنم دیا ہے۔ لیکن وہ کبھی کبھی ارینا کی طرف اپنے ہاتھ پھیلا رہی تھی تاکہ اس سے بچ لیکر اپنے خیال کی تصدیق کر لے۔

وہ ہسپتال پہنچے۔ اور جب عورت کو بستر پر لٹا دیا گیا۔ اور تمام انتظامات مکمل ہو گئے تو اس نے ارینا کو بلایا اور آہستگی

سے دریافت کیا۔

”تمہارا نام کیا ہے۔“  
 ”کیوں۔ کیا تم معلوم کرنا چاہتی ہو؟“ اربینا نے پوچھا۔

”مجھے جاننا چاہئے۔“

”میرا نام اربینہ ہے۔ لیکن تم کیوں دریافت کر رہی ہو۔“  
 ”وہ میں اپنی بچی کا یہی نام رکھوں گی تاکہ وہ تمہیں فراموش  
 نہ کر سکے۔ تم نے اس کی جان بچائی ہے۔ میں تہ دل سے تمہارا  
 شکر یہ ادا کرتی ہوں۔“

اور اس نے اسے تین بار چوما۔ اربینا دوسری طرف پلٹ گئی۔  
 اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ کیوں؟  
 اسے معلوم نہ تھا۔

---

# روسی گریلا

مترجم

ڈاکٹر الہام

روسی سوراؤں کے جانفروشانہ اقدامات بڑے سلمقے سے جمع کئے گئے ہیں جنہیں فسٹاسیت کے خلاف ان کی بے جگرانہ جدوجہد کو اجاگر کیا گیا ہے اس عوامی جنگ کے خانمہ پر روسی فائجن کے کارنامے اور انکی تفصیلات یقیناً دلچسپ اور قابلِ مصلحہ ہے رنگین جاذبِ نظر سرورق قیمت ۱۲/۱۲

---

---

# دلکش شخصیت

۱۲

برزوجی تارا پوری

مغربی ماہرین نفسیات کے نفسیاتی نظریوں اور جدید تحقیقی  
مسئلوں کو بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے مشہور  
انگریزی کتاب ننگ پر سنالیٹی کا اردو ترجمہ جسے پروفیسر آپ  
اپنی زندگی زیادہ کامیاب اور خوشگوار بنا سکتے ہیں۔

دیدہ زیب سرورق قیمت ۱۲/۱۱

---

# فلمی سلیاں (با تصویر)

۱۲

بجلی جامپوری

نرگس، بیگم پارا، وینا، ثریا، نینا، جے شری، وسمالا کے علاوہ ایک سو مشلات کے حالات زندگی کو انتہائی رنگین زبان میں موعظاً ویر کے اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ یہ اردو زبان میں فلمی دنیا کے چمکتے ستاروں کے خانگی ڈومانی حالات سے متعلق پہلی کتاب ہے

مجلد گردپوش قیمت (۷۰)

(۱) راج پبلشنگ کی تمام تر مطبوعات ہم سے طلب

کیجئے

(۲) اضلاع اور بیرون ملک کے شایقین کے لئے

ممکنہ سہولتوں پر ہم کتابیں سپلائی کرتے ہیں۔

(۳) تاجبران کتب خاص رعایتوں پر یہ کتابیں

حاصل کر سکتے ہیں

تفضیلات کے لئے پتہ ذیل سے خط و کتابت کیجئے

۳۷  
وینا بک سپلائی پوسٹس

سکندر آباد (دکن)

---

# دور اسیری

۲۸

## وجہ لکشمی پنڈت

مسٹر پنڈت کا نام کسی نقاری کا محتاج نہیں ہے۔  
سان فرانسسکو کانفرنس میں سامراجیوں کے تعمیر کیے  
ہوئے قلعوں کو مسمار کر کے ہندوستان کے حقیقی  
حالات کو بین الاقوامی نقطہ نظر سے پیش کرنیوالی خاتون  
کے جیل کے حالات جسے خود انھوں نے قلمبند کیا ہے۔  
اور مشہور جرنلسٹ ظفر جاوید نے ترجمہ کیا ہے۔

(زیر طبع)

---









